

# عطرِ کافور

نیّر مسعود

# عطرِ کافور

افسانے

# عطرِ کافور

نیّر مسعود



نصرت

بارِ اوّل: ۱۹۹۰ء

ناشر: نیّر مسعود

مطبع: نظامی پریس، لکھنؤ

قیمت: -/۲۲ خاص ایڈیشن -/۳۰

# ترتیب

یہ کتاب فخرالدین علی احمد میموریل کمیٹی، حکومتِ اترپردیش، لکھنؤ
کے مالی تعاون سے شائع ہوئی۔

ایں ہمہ نقش عجب بر در و دیوارِ وجود
ہر کہ فکرت نکند نقش بُوَد بر دیوار

سُننے میں ایک اثر ہے جو جاننے میں نہیں۔

(علیؓ ابنِ ابی طالب)

# مراسلہ

My days among the dead are past.

ROBERT SOUTHEY

آنہا کہ کہن شدند وانیہا کہ نوند

(خیّام)

# مراسلہ

"مکرمی، آپ کے موقر اخبار کے ذریعے میں متعلقہ حکام کو شہر کے مغربی علاقے کی طرف متوجہ کرانا چاہتا ہوں۔ مجھے بڑے افسوس کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ آج جب بڑے پیمانے پر شہر کی توسیع ہو رہی ہے اور ہر علاقے کے شہریوں کو جدید ترین سہولتیں بہم پہنچائی جا رہی ہیں، یہ مغربی علاقہ بجلی اور پانی کی لائنوں تک سے محروم ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس شہر کی تین ہی سمتیں ہیں۔ حال میں جب ایک مدت کے بعد میرا اس طرف ایک ضرورت سے جانا ہوا تو مجھ کو شہر کا یہ علاقہ بالکل ویسا ہی نظر آیا جیسا میرے بچپن میں تھا۔"

(۱)

مجھے اس طرف جانے کی ضرورت نہیں تھی، لیکن اپنی والدہ کی وجہ سے مجبور ہو گیا۔ برسوں پہلے وہ بڑھاپے کے سبب چلنے پھرنے سے معذور ہو گئی تھیں، پھر ان کی آنکھوں کی روشنی بھی قریب قریب جاتی رہی اور ذہن بھی ماؤف سا ہو گیا۔ معذوری کا زمانہ شروع ہونے کے بعد بھی ایک عرصے تک ہر روز مجھ کو دو دن رات میں تین چار مرتبہ اپنے قریب بلا کر کپکپاتے ہاتھوں سے سر سے پیر تک ٹٹولتی تھیں۔

دراصل میرے پیدا ہونے کے بعد ہی سے ان کو میری صحت خراب معلوم ہونے لگی تھی۔ کبھی انہیں میرا بدن بہت ٹھنڈا محسوس ہوتا کبھی بہت گرم، کبھی میری آواز بدلی بدلی معلوم ہوتی اور کبھی میری آنکھوں کی رنگت میں تغیر نظر آتا۔ حکیموں کے ایک پرانے خاندان سے تعلق رکھنے کی وجہ سے ان کو بہت سی بیماریوں کے نام اور علاج زبانی یاد تھے اور کچھ کچھ دن بعد وہ مجھے کسی نئے مرض میں مبتلا قرار دے کر اس کے علاج پر اصرار کرتی تھیں۔

ان کی معذوری کے ابتدائی زمانے میں دو تین بار ایسا اتفاق ہوا کہ میں کسی کام میں پڑ کر ان کے کمرے میں جانا بھول گیا، تو وہ معلوم نہیں کس طرح خود کو کھینچتی ہوئی کمرے کے دروازے تک لے آئیں۔ کچھ اور زمانہ گزرنے کے بعد جب ان کی ذہنی سہی طاقت بھی جواب دے گئی تو ایک دن ان کے معالج نے محض یہ آزمانے کے لیے کہ آیا ان کے ہاتھ پیروں میں اب بھی کچھ سکت باقی ہے، مجھ کو دن بھر ان کے پاس نہیں جانے دیا، اور وہ بظاہر مجھ سے بے خبر رہیں، لیکن رات گئے ان کے آہستہ آہستہ کراہنے کی آواز سن کر جب میں لپکتا ہوا ان کے کمرے میں پہنچا تو وہ دروازے تک کا آدھا راستہ طے کر چکی تھیں۔ اُن کا بستر، جو انھوں نے میرے والد کے مرنے کے بعد سے زمین پر بچھانا شروع کر دیا تھا، اُن کے ساتھ گھسٹتا ہوا چلا آیا تھا، اور دیکھنے میں ایسا معلوم ہوتا تھا کہ بستر ہی ان کو کھینچتا ہوا دروازے کی طرف لیے جا رہا تھا۔ مجھے دیکھ کر انھوں نے کچھ کہنے کی کوشش کی لیکن تکان کے سبب بے ہوش ہو گئیں اور کئی دن تک بے ہوش رہیں۔ ان کے معالج نے بار بار اپنی غلطی کا اعتراف اور اس آزمائش پر پچھتاوے کا اظہار کیا اس لیے کہ اس کے بعد ہی سے میری والدہ کی بینائی اور ذہن نے جواب دینا شروع کیا یہاں تک کہ رفتہ رفتہ ان کا وجود اور عدم برابر ہو گیا۔

ان کے معالج کو مرے ہوئے بھی ایک عرصہ گزر گیا، لیکن حال ہی میں ایک رات میری آنکھ کھلی تو میں نے دیکھا کہ وہ میرے پائینتی زمین پر بیٹھی ہوئی ہیں اور ایک

ہاتھ سے میرے بستر کو ٹٹول رہی ہیں۔ میں جلدی سے اٹھ کر بیٹھ گیا۔

"آپ ..."، میں نے ان کے ہاتھ کی پشت پر خشک رگوں کے جال کو دیکھتے ہوئے پوچھا، "... یہاں آگئیں؟"

"تمھیں دیکھنے... کیسی طبیعت ہے؟" انھوں نے اٹک اٹک کر کہا۔ پھر ان پر غفلت طاری ہو گئی۔

میں بستر سے اتر کر زمین پر ان کے برابر بیٹھ گیا اور دیر تک چپ چاپ ان کو دیکھتا رہا۔ میں نے ان کی اس صورت کا تصور کیا جو میری اوّلین یادوں میں محفوظ تھی اور چند لمحوں کے لیے ان کے بوڑھے چہرے کی جگہ انھیں یادوں والا چہرہ میرے سامنے آگیا۔ اتنی دیر میں ان کی غفلت کچھ دور ہوئی۔ میں نے آہستگی سے انھیں اٹھانے کی کوشش کرتے ہوئے کہا:

"آیئے آپ کو آپ کے کمرے میں پہنچا دوں۔"

"نہیں"، انھوں نے بڑی مشکل سے کہا، "پہلے بتاؤ۔"

"کیا بتاؤں؟" میں نے تھکے ہوئے لہجے میں پوچھا۔

"طبیعت کیسی ہے؟"

کچھ دن سے میری طبیعت واقعی خراب تھی، اس لیے میں نے کہا۔

"ٹھیک نہیں ہوں۔"

میری توقع کے خلاف انھوں نے بیماری کی تفصیل دریافت کرنے کے بجائے صرف اتنا پوچھا:

"کسی کو دکھایا؟"

"کس کو دکھاؤں؟"

مجھے معلوم تھا وہ کیا جواب دیں گی۔ یہ جواب وہ فوراً اور ہمیشہ تیز لہجے میں

دیتی تھیں. لیکن اس بار انھوں نے دیر تک چپ رہنے کے بعد بڑی افسردگی اور قدرے مایوسی کے ساتھ وہی بات کہی :

"تم وہاں کیوں نہیں چلے جاتے ؟"

میں اُن کے ساتھ بچپن میں وہاں جایا کرتا تھا۔ وہ پرانے حکیموں کا گھرانا تھا۔ یہ لوگ میری والدہ کے قریبی عزیز تھے۔ اُن کا مکان بہت بڑا تھا جس کے مختلف درجوں میں کئی خاندان رہتے تھے۔ ان سب خاندانوں کے سربراہ ایک حکیم صاحب تھے جنھیں شہر میں کوئی خاص شہرت حاصل نہیں تھی لیکن آس پاس کے دیہاتوں سے اُن کے یہاں اتنے مریض آتے تھے جتنے شہر کے نامی ڈاکٹروں کے پاس بھی نہ آتے ہوں گے۔

اُس مکان میں تقریبیں بہت ہوتی تھیں جن میں میری والدہ کو خاص طور پر بلایا جاتا تھا اور اکثر وہ مجھے بھی ساتھ لے جاتی تھیں۔ میں اُن تقریبوں کی عجیب عجیب رسموں کو بڑی دل چسپی سے دیکھتا تھا۔ میں یہ بھی دیکھتا تھا کہ وہاں میری والدہ کی بڑی قدر ہوتی ہے اور ان کے پہنچتے ہی سارے مکان میں خوشی کی لہر دوڑ جاتی ہے۔ وہ خود بھی وہاں کی کسی فرد کو فراموش نہ کرتیں، چھوٹوں اور برابر والوں کو اپنے پاس بلاتیں، بڑوں کے پاس آپ جاتیں، اور وہاں کے خاندانی جھگڑوں میں جو اکثر ہوا کرتے، اُن کا فیصلہ سب کو منظور ہوتا تھا۔

وہاں اتنے بہت سے لوگ تھے، لیکن مجھ کو صرف حکیم صاحب کا چہرہ دھندھلا دھندھلا سا یاد تھا، وہ بھی شاید اس وجہ سے کہ ان میں اور میری والدہ میں ہلکی سی خاندانی مشابہت تھی۔ اتنا مجھے البتہ یاد ہے کہ وہاں ہر عمر کی عورتیں، مرد اور بچے جو در رہتے تھے اور اُن کے ہجوم میں گھری ہوئی اپنی والدہ مجھے ایسی معلوم ہوتی تھیں

جیسے بہت سی پتیوں کے بیچ میں کوئی پھول کھلا ہوا ہو۔

لیکن اس وقت وہ اپنا مرجھایا ہوا چہرہ میری طرف گھمائے ہوئے اپنی بجھی ہوئی آنکھوں سے میرا چہرہ دیکھنے کی کوشش کر رہی تھیں۔

"تمھاری آواز بیٹھی ہوئی ہے، چکنائی والی چیزیں نہ کھایا کرو"، انھوں نے کہا، اور پھر کہا، "تم وہاں کیوں نہیں چلے جاتے؟"

"وہاں... اب میں وہاں کسی کو پہچان بھی نہ پاؤں گا۔"

"دیکھوگے تو پہچان لوگے۔ نہیں تو وہ لوگ خود بتائیں گے۔"

"اتنے دن ہو گئے"، میں نے کہا، "اب مجھے راستہ بھی یاد نہیں۔"

"باہر نکلو گے تو یاد آتا جائے گا۔"

"کس طرح؟" میں نے کہا، "سب کچھ تو بدل گیا ہوگا۔"

"کچھ بھی نہیں"، انھوں نے کہا، پھر اُن پر غفلت طاری ہونے لگی لیکن ایک بار پھر انھوں نے کہا:

"کچھ بھی نہیں۔"

اس کے بعد وہ بالکل غافل ہو گئیں۔

میں دیر تک اُن کو سہارا دیے بیٹھا رہا۔ میں نے اس مکان کا راستہ یاد کرنے کی کوشش کی۔ میں نے اُن دنوں کا تصوّر کیا جب میں اپنی والدہ کے ساتھ وہاں جایا کرتا تھا۔ میں نے اس مکان کا نقشہ بھی یاد کرنے کی کوشش کی لیکن مجھے اس کے سوا کچھ یاد نہ آیا کہ اس کے صدر دروازے کے سامنے ایک ٹیلا تھا جو حکیموں کا چبوترہ کہلاتا تھا۔ اتنا اور مجھے یاد تھا کہ حکیموں کا چبوترہ شہر کے مغرب کی جانب تھا۔ اس پر چند کچی قبریں اور جھاڑیاں تھیں، اور اس تک پہنچتے پہنچتے شہر کے آثار ختم ہو جاتے تھے۔

میں نے اپنی والدہ کو اپنے ہاتھوں پر اٹھالیا، بالکل اسی طرح جیسے کبھی وہ مجھ کو اٹھایا کرتی تھیں، اور یہ سمجھا کہ میں نے ان کا کچھ قرض اتارا ہے، اور اگرچہ وہ بالکل غافل تھیں لیکن میں نے ان سے کہا:

"آیئے آپ کو آپ کے کمرے میں پہنچادوں۔ کل سویرے میں وہاں ضرور جاؤں گا۔"

دوسرے دن سورج نکلنے کے کچھ دیر بعد میری آنکھ کھلی اور آنکھ کھلنے کے کچھ دیر بعد میں گھر سے روانہ ہو گیا۔

(۲)

خود اپنے محلّے کے مغربی حصّے کی طرف ایک مدّت سے میرا گذر نہیں ہوا تھا اب جو میں ادھر سے گذرا تو مجھے بڑی تبدیلیاں نظر آئیں۔ کچّے مکان پکّے ہو گئے تھے خالی پڑے ہوئے احاطے چھوٹے چھوٹے بازاروں میں بدل گئے تھے۔ ایک پُرانے مقبرے کے کھنڈر کی جگہ عمارتی لکڑی کا گودام بن گیا تھا۔ جن چہروں سے میں بہت پہلے آشنا تھا اُن میں سے کوئی نظر نہیں آیا، اگرچہ مجھ کو جاننے والے کئی لوگ ملے جن میں سے کچھ کو میں بھی جانتا تھا، لیکن مجھ کو یہ معلوم نہیں تھا کہ وہ میرے ہی ہم محلّہ ہیں۔ میں نے اُن سے رسمی باتیں بھی کیں، لیکن کسی کو یہ نہیں بتایا کہ میں کہاں جا رہا ہوں۔

کچھ دیر بعد میرا محلّہ پیچھے رہ گیا۔ غلّے کی منڈی آئی اور نکل گئی۔ پھر دواؤں اور مسالوں کی منڈی آئی اور پیچھے رہ گئی۔ اِن منڈیوں کے داہنے بائیں دور دور تک پختہ سڑکیں تھیں جن پر کھانے پینے کی چیزوں کی عارضی دکانیں بھی لگی ہوئی تھیں لیکن میں جس سڑک پر سیدھا آگے بڑھ رہا تھا اُس پر اب جا بجا گڈّھے نظر آ رہے تھے۔ کچھ

اور آگے بڑھ کر سڑک بالکل کچی ہو گئی۔ راستہ یاد نہ ہونے کے باوجود مجھے یقین تھا کہ میں صحیح سمت جا رہا ہوں اس لیے میں آگے بڑھتا رہا۔

دھوپ میں تیزی آگئی تھی اور اب کچی سڑک کے آثار بھی ختم ہو گئے تھے، البتہ گرد آلود پتیوں والے درختوں کی دور دور تک ٹیڑھی میڑھی قطاروں کے درمیان اس کا تصور کیا جا سکتا تھا لیکن اچانک یہ قطاریں اس طرح منتشر ہوئیں کہ سڑک ہاتھ کے پھیلے ہوئے پنجے کی طرح پانچ طرف اشارہ کر کے رہ گئی۔ یہاں پہنچ کر میں تذبذب میں پڑ گیا۔ مجھے گھر سے نکلے ہوئے بہت دیر نہیں ہوئی تھی اور مجھ کو یقین تھا کہ میں اپنے محلے سے بہت دور نہیں ہوں پھر بھی میں نے وہاں پر ٹھہر کر واپسی کا راستہ یاد کرنے کی کوشش کی۔ میں نے پیچھے مڑ کر دیکھا۔ گرد آلود پتیوں والے درخت اونچی نیچی زمین پر ہر طرف تھے۔ میں نے ان کی قطاروں کے درمیان سڑک کا تصور کیا تھا لیکن وہ قطاریں بھی شاید میرے تصور کی پیداوار تھیں اس لیے کہ اب اُن کا کہیں پتا نہ تھا۔ اپنے حساب سے میں بالکل سیدھی سڑک پر چلا جا رہا تھا لیکن مجھے بار بار اس کا تجربہ ہو چکا تھا کہ دیکھنے میں سیدھی معلوم ہونے والی سڑکیں اتنے غیر محسوس طریقے پر اِدھر اُدھر گھوم جاتی ہیں کہ اُن پر چلنے والے کو خبر بھی نہیں ہوتی اور راستے کا رخ کچھ کا کچھ ہو جاتا ہے۔ مجھے یقین تھا کہ یہاں تک پہنچتے پہنچتے میں کئی مرتبہ اِدھر اُدھر گھوم چکا ہوں اور اگر مجھ کو سڑک کا سراغ نہ ملا تو میں خود سے اپنے گھر تک نہیں پہنچ سکتا لیکن اس وقت مجھ کو واپسی کے راستے سے زیادہ دیکھیوں کے چبوترے کی فکر تھی جو کہیں دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ ہر طرف پھیلے ہوئے درخت اتنے چھدرے تھے کہ زمین کا کوئی بڑا حصہ میری نگاہوں سے اوجھل نہیں تھا لیکن میرے بائیں ہاتھ زمین دور تک اونچی ہو گئی تھی اور اس پر جگہ جگہ سنجان جھاڑیاں آپس میں الجھی ہوئی تھیں۔ اُن کی وجہ سے بلندی کے دوسری طرف والا نشیبی حصہ نظر نہیں آتا تھا۔

اگر کچھ ہوگا تو اُدھر ہی ہوگا، میں نے سوچا اور اُس سمت چل پڑا۔ میرا خیال صحیح تھا۔ جھاڑیوں کے ایک بڑے جھنڈ میں سے نکلتے ہی مجھے سامنے کتھئی رنگ کی پتلی پتلی اینٹوں والا ایک یک منزلہ مکان نظر آیا۔ یہ وہ مکان نہیں تھا جس کی مجھے تلاش تھی۔ تاہم میں سیدھا اس کی طرف بڑھتا گیا۔ اس کے دروازے پر کسی کے نام کی تختی لگی ہوئی تھی جس کے قریب قریب سب حرف مٹ چکے تھے۔ مکان کے اندر خاموشی تھی لیکن ویسی نہیں جیسی ویران مکانوں سے باہر نکلتی محسوس ہوتی ہے، اس لیے میں نے دروازے پر تین بار دستک دی۔ کچھ دیر بعد دروازے کے دوسری طرف ہلکی سی آہٹ ہوئی اور کسی نے آہستہ سے پوچھا:

"کون صاحب ہیں؟"

بتانے سے کیا فائدہ، میں نے سوچا اور کہا:

"میں شاید راستہ بھول گیا ہوں۔ حکیموں کا چبوترہ اِدھر ہی کہیں ہے؟"

"حکیموں کا چبوترہ... آپ کہاں سے آئے ہیں؟"

یہ غیر متعلق بات تھی۔ اپنے سوال کے جواب میں سوال سُن کر مجھے ہلکی سی جھنجھلاہٹ محسوس ہوئی، لیکن دروازے کے دوسری طرف کوئی عورت تھی جس کی آواز نرم اور لہجہ بہت مہذب تھا۔ اُس نے دروازے کے خفیف سے کھلے ہوئے پٹ کو پکڑ رکھا تھا۔ اس کے ناخن نارنجی پالش سے رنگے ہوئے تھے۔ مجھے وہم سا ہوا کہ دروازے کا پٹ تھوڑا اور کھلا اور ایک لمحے کے اندر مجھ کو دروازے کے پیچھے چھوٹی سی نیم تاریک ڈیوڑھی اور ڈیوڑھی کے پیچھے صحن کا ایک گوشہ اور اس میں لگے ہوئے انار کے درخت کی کچھ شاخیں نظر آگئیں جن پر دھوپ پڑ رہی تھی۔ اور دوسرے لمحے مجھے کچھ کچھ یاد آیا کہ میری والدہ کبھی کبھی تھوڑی دیر کے لیے اِس مکان میں بھی اُترتی تھیں۔ لیکن اِس مکان کے رہنے والے بھی مجھے یاد نہ آسکے۔

"آپ کہیں باہر سے آئے ہیں؟" دروازے کے دوسری طرف سے پھر آواز آئی۔
"جی نہیں"، میں نے کہا اور اپنا اتا پتا بتا دیا، پھر کہا، "بہت دنوں کے بعد اِدھر آیا ہوں۔"

دیر کے بعد مجھے جواب ملا:

"اِس مکان کے پیچھے چلے جایئے۔ چبوترہ سامنے ہی دکھائی دے گا۔"

مکان کے اندرونی حصّے سے کسی بوڑھی عورت کی بھاری آواز سنائی دی:

"کون آیا ہے، مہر؟"

میں رسمی شکریہ ادا کر کے مکان کی پشت پر آ گیا۔ سامنے دور تک چھوٹے بڑے کئی ٹیلے نظر آ رہے تھے اور اُن کی بے ترتیب قطاریں پھر ایک سڑک کا تصوّر پیدا کر رہی تھیں۔ یہ ٹیلے محض مٹی کے تودے تھے لیکن اُن سے ذرا ہٹ کر ایک ٹیلے پر جھاڑیاں نظر آ رہی تھیں۔ میں نے اُس ٹیلے کو غور سے دیکھا۔ جھاڑیوں کے بیچ بیچ میں کچّی قبروں کے نشان نمایاں تھے۔ بعض بعض قبروں پر چونے کی سفیدی تیز دھوپ میں چمک رہی تھی۔

(۳)

مکان چبوترے کی اوٹ میں تھا اور اُس تک پہنچنے کے لیے مجھے چبوترے کا آدھا چکر کاٹنا پڑا۔ پرانی لکڑی کے بھاری صدر دروازے کے سامنے کھڑا دیر تک میں سوچتا رہا کہ اپنے آنے کی اطلاع کس طرح کراؤں۔ دروازے کی لکڑی بہت دبیز اور تھوڑی سیلی ہوئی تھی۔ اُس پر دستک دینے سے کوئی فائدہ نہیں تھا، پھر بھی میں نے تین بار اُس پر ہاتھ مارا، لیکن اپنی دستک کی آواز خود مجھ کو ٹھیک سے سنائی نہیں دی۔ مجھے شبہہ ہوا کہ مکان ویران ہے۔ میں نے دروازے کو آہستہ سے دھکّا دیا تو اُس کے دونوں پٹ بڑی سہولت کے ساتھ اپنی چولوں پر گھوم گئے اور مجھ کو اپنے سامنے

ایک کشادہ ڈیوڑھی نظر آئی جس کے سرے پر ایک چھوٹا دروازہ تھا۔ یہ دروازہ پورا کھلا ہوا تھا لیکن اس پر دُہرے ٹاٹ کا پردہ لٹک رہا تھا۔ میں دروازے کے قریب گیا اور اب مجھے مکان کے اندر لوگوں کے بولنے چالنے کی آوازیں سنائی دیں۔ میں نے دستک دی اور اندر کسی نے کسی کو پکار کر کہا:

"دیکھو، کوئی آیا ہے۔"

تب میرا دماغ سوالوں سے منتشر ہونا شروع ہوا۔ اس مکان میں کون کون ہے، میں کس سے کیا بات کروں گا، اپنے آنے کی غرض کیا بتاؤں گا، اپنے کو کس طرح پہچنواؤں گا۔ میرا جی چاہا کہ واپس لوٹ جاؤں، لیکن اسی وقت پردے کے پیچھے سے کسی عورت نے روکھے لہجے میں پوچھا:

"کون ہے؟"

میں نے اپنا پورا نام بتایا۔

"کس سے ملنا ہے؟"

اس کا میرے پاس ایک ہی جواب تھا۔

"حکیم صاحب سے"، میں کہا۔

"مطب دوسری طرف ہے۔ وہیں جائیے۔ وہ تیار ہو رہے ہیں۔"

آخری لفظوں تک پہنچتے پہنچتے آواز دور ہونا شروع ہو گئی تھی اس لیے میں نے جلدی سے اور ذرا بلند آواز میں کہا:

"اندر اطلاع کر دیجیے۔"

آواز پھر قریب آ گئی اور اب اس کے لہجے کا روکھا پن کچھ کم ہوا۔

"آپ کہاں سے آئے ہیں؟"

میں نے یہاں بھی اپنا آتا پتا بتایا۔ کچھ توقف کیا۔ پھر اپنی والدہ کا نام لیا۔ پھر

توقف کیا۔ پھر اُن کا گھر کا نام بتایا۔ یہ بتایا کہ میں اُن کا بیٹا ہوں۔ پھر جھجکتے جھجکتے اپنا ددّا کا نام بھی بتا دیا جس سے میں بچپن میں چڑتا تھا۔ میں نے یہ سب کچھ بہت بے ربط انداز میں بتایا جسے پردے کے اُدھر والی عورت نے دور کسی کے پوچھنے پر قدرے مربوط کر کے دُہرا دیا اور مکان کے اندر عورتوں کے بولنے کی آوازیں تھوڑی دیر کے لیے تیز ہو گئیں۔ مجھے ان آوازوں میں اپنی والدہ کا گھر کا نام اور اپنا بچپن والا نام بار بار سنائی دیا۔ یہ دونوں نام میں بہت دنوں کے بعد سُن رہا تھا۔ مُجھے یقین ہو گیا کہ اگر یہ نام اسی طرح سنائی دیتے رہے تو مجھ کو اس مکان کا پورا نقشہ اور اس کے رہنے والے سب یاد آجائیں گے، بلکہ میرے ذہن میں ایک کشادہ صحن کا نقش بننا شروع بھی ہو گیا تھا لیکن عین اس وقت ہلکی سی کھڑکھڑاہٹ کے ساتھ ٹاٹ کا پردہ میری طرف بڑھا، اوپر اُٹھا اور اُس کے نیچے سے ایک بائیسکل کا اگلا پہیا نمودار ہوا۔ میں ایک کنارے ہو گیا اور بائیسکل لیے ہوئے ایک لڑکا اندر سے ڈیوڑھی میں آیا اور مجھے سلام کرتا ہوا صدر دروازے سے باہر نکل گیا۔ میں خاموش کھڑا انتظار کرتا رہا۔ کچھ دیر بعد پردے کے پیچھے سے دبی دبی آوازیں آئیں اور چار پانچ بطخیں پردے کے نیچے سے نکل کر ڈیوڑھی میں آئیں۔ اُن کی بے ترتیب قطار دیکھ کر صاف معلوم ہوتا تھا کہ انھیں باہر کی طرف ہنکایا گیا ہے۔ بطخیں آپس میں چہ می گوئیاں سی کرتی اور ڈگمگاتی ہوئی صدر دروازے کی طرف بڑھ گئیں۔ اس کے بعد مکان کے اندر سے دیر تک کوئی آواز نہیں آئی۔ میں ڈیوڑھی میں کھڑے کھڑے اکتا گیا اور مجھے وہم ہونے لگا کہ پردے کے پیچھے سے ویران مکانوں والی خاموشی باہر نکل نکل کر مجھ کو اپنی لپیٹ میں لے رہی ہے، لیکن اُسی وقت دوسری طرف سے کسی نے کہا:

"آیئے، اندر چلے آیئے۔"

دُہرے ٹاٹ کا پردہ ایک طرف کر کے میں اُس مکان کے صحن میں اُتر گیا

---

بڑے صحن، دُہرے تہرے دالانوں، شہ نشینوں، صحنچیوں اور لکڑی کی محرابوں والے مکان میں نے اپنے بچپن میں بہت دیکھے تھے۔ یہ مکان اُن سے مختلف نہیں تھا لیکن مجھے یاد نہ آسکا کہ کبھی میں یہاں آیا کرتا تھا۔ کشادہ صحن کے بیچ میں چند لمحوں کے لیے رُک کر میں نے دیکھا کہ مکان کا ہر درجہ آباد ہے۔ کئی صحنچیوں سے عورتیں گردن باہر نکالے متجسّس نظروں سے میری طرف دیکھ رہی تھیں۔ میں نے اندازہ لگایا کہ اس گھر کی بیگم کو کس حصّے میں ہونا چاہیے، اور سیدھا اُس دالان کی طرف بڑھتا گیا جس کی بلند محرابوں میں عنّابی رنگ کے بڑے قمقمے لٹک رہے تھے۔ دالان میں بیچ تخنتوں کا چوکا اور اس کے دونوں طرف بھاری مسہریاں تھیں۔ سب پر صاف دُھلی ہوئی چادریں بچھی تھیں جن کا ابھی کلف بھی نہ ٹوٹا تھا۔ چوکے پر ایک معمّر خاتون بیٹھی ہوئی تھیں۔ میں نے انھیں پہچانے بغیر سلام کیا۔ انھوں نے آہستہ سے مسکرا کر بہت سی دعائیں دیں، پھر بولیں۔

"بیٹے، آج اِدھر کہاں بھول پڑے؟"

مجھے خیال ہوا یہ سوال اس لیے نہیں کیا گیا ہے کہ اس کا جواب دیا جائے لہٰذا اپنے امکان بھر شائستگی کے ساتھ میں نے اُن کی مزاج پرسی کی، اور وہ بولیں:

"تمھیں تو اب کیا یاد ہوگا، چھٹ پنے میں تم یہاں آتے تھے تو جانے کا نام نہیں لیتے تھے۔"

پھر انھوں نے کئی ایسی تقریبوں کا ذکر کیا جن کے بعد میری والدہ کو اس مکان میں محض میری ضد کی وجہ سے کئی کئی دن رکنا پڑا تھا۔

"تب بھی تم روتے ہوئے جاتے تھے"، انھوں نے کہا اور دوپٹے کے پلّو سے آنکھیں پونچھیں۔

اس دوران مکان کے مختلف درجوں سے نکل نکل کر عورتیں اس بڑے دالان میں جمع ہوتی رہیں۔ ان میں سے زیادہ تر نے اپنا تعارف خود کرایا۔ پیچیدہ رشتے میری سمجھ میں نہیں آتے تھے لیکن میں نے یہ ظاہر کیا کہ ہر تعارف کرانے والی کو میں پہچان گیا ہوں اور ہر رشتہ مجھے پہلے ہی معلوم تھا۔ سب عورتوں نے بالوں میں بہت بہت سا تیل لگا کر چپٹی کنگھی کر رکھی تھی، سب موٹے سوتی دوپٹے اوڑھے تھیں جن میں سے بعض بعض گھر کے رنگے ہوئے معلوم ہوتے تھے۔ ہر ایک کے پاس میرے بچپن کے قصوں کا ذخیرہ تھا۔ مجھے صحن کے کنارے لگا ہوا امرود کا ایک درخت دکھایا گیا جس پر سے گر کر میں بے ہوش ہو گیا تھا اور مجھ کو بے ہوش دیکھ کر میری والدہ بھی بے ہوش ہو گئی تھیں۔ میری شرارتوں کا ذکر چھڑا تو معلوم ہوا میں نے وہاں پر موجود ہر عورت کو کسی نہ کسی شرارت کا نشانہ بنایا تھا۔

مجھے احساس ہوا کہ میں دیر سے ایک لفظ بھی نہیں بولا ہوں۔ سب لوگ شاید اب میرے بولنے کے منتظر تھے اور دالان میں کچھ خاموشی ہو گئی تھی۔ میں نے اِدھر اُدھر نظر دوڑائی تو چوکے پر ایک طرف تین چار لڑکیاں بیٹھی دکھائی دیں۔ میں نے اُن سے اُن کی پڑھائی اور دوسرے مشغلوں کے بارے میں دریافت کیا تو وہ شرما کر ایک دوسرے کے قریب سمٹنے لگیں اور اُن کی جانب سے دوسروں نے جواب دیے۔ اُن سے کچھ فاصلے پر تین لڑکے کسی وقت آ کر بیٹھ گئے تھے۔ میں نے اُن سے اپنے خیال میں اُن کی دل چسپی کی دو چار باتیں کیں، لیکن مجھے معلوم نہیں تھا کہ انھیں کن باتوں میں دل چسپی ہے۔ لڑکے مجھے بے وقوف اور لڑکیاں بدصورت معلوم ہوئیں، لیکن لڑکیوں کا شرمانا اچھا لگا۔ میں اُن سے کچھ اور باتیں کرنے کے لیے اُن کی دل چسپی کا کوئی موضوع سوچ رہا تھا کہ ڈیوڑھی کے دروازے پر کھڑکھڑاہٹ ہوئی۔ بائیسکل والا لڑکا واپس آ گیا تھا۔ اُس کے ہاتھوں میں اخباری کاغذ کی کئی پڑیاں تھیں جن میں بعض پر چکنائی پھوٹ آئی تھی۔

اس نے دالان کی طرف دیکھ کر کچھ اشارہ کیا اور لڑکیاں اُٹھ کر چلی گئیں۔ کچھ دیر بعد قریب کے کسی درجے سے اُن کے ہنسنے اور چینی کے برتن بجنے کی آوازیں آئیں۔ مجھے دونوں آوازوں میں مبہم سی مشابہت محسوس ہوئی، اور یہ بھی شبہہ ہوا کہ لڑکیاں میرے بولنے کی نقل اتار رہی ہیں۔

میں نے اندازہ کرنے کی کوشش کی کہ مجھے اس دالان میں بیٹھے کتنی دیر ہوئی ہوگی لیکن اسی وقت میرے بائیں ہاتھ پر ایک دروازہ کھلا اور اس کی چلمن کے پیچھے حکیم صاحب کھڑے نظر آئے۔ میں نے انھیں فوراً پہچان لیا۔ وہ سر پر ٹوپی کا زاویہ درست کر رہے تھے۔ پھر وہ چلمن کی طرف منھ کر کے اپنی جیبوں میں کچھ ٹٹولنے لگے۔ ان کے پیچھے ایک اور دروازہ نظر آ رہا تھا جس کے قریب دیہاتی مردوں اور عورتوں کا مجمع لگا ہوا تھا۔

"ارے بھئی، ہم آ رہے ہیں"، انھوں نے کہا اور چلمن اُٹھائی۔

"آ جائیے"، گھر کی بیگم بولیں، "دیکھیے کون آیا ہے۔ پہچانا؟"

حکیم صاحب دالان میں آ گئے تھے۔ میں نے جلدی سے اٹھ کر انھیں سلام کیا اور انھوں نے آہستہ سے میرا پورا نام لیا، پھر بولے:

"میاں، آپ تو بہت بدل گئے۔ کہیں اور دیکھتا تو بالکل نہ پہچانتا۔"

کچھ دیر تک وہ بھی مجھے میرے بچپن کی باتیں بتاتے اور میرے والد کی وضع داری کے قصے سناتے رہے۔ اتنے میں ایک ملازمہ پیتل کی ایک لمبی کشتی میں کھانے کی چیزیں لے کر آ گئی۔ میں نے ایک نظر کشتی میں لگی ہوئی چینی کی نازک طشتریوں کو دیکھا۔ اُن میں زیادہ تر بازار کا سامان تھا لیکن کچھ چیزیں گھر کی بنی ہوئی بھی تھیں۔ حکیم صاحب نے کشتی کی طرف اشارہ کیا اور بولے:

"یہاں تکلف سے کام مت لیجیے گا"، پھر بیگم سے بولے، "اچھا بھئی، ہم کو دیر ہو رہی ہے۔"

اس کے بعد وہ واپس اپنے کمرے میں چلے گئے۔

"ان کو مطب سے فرصت ہی نہیں ہوتی"، بیگم نے معذرت کے انداز میں کہا۔ وہ کچھ اور بھی کہہ رہی تھیں مگر مجھ پر شاید تھوڑی دیر کو غنودگی سی طاری ہوگئی تھی، اس لیے کہ جب میں چونکا تو دالان میں صرف بیگم تھیں اور اس کی دو محرابوں پر کسی موٹے کپڑے کے پردے جھول رہے تھے۔ صرف بیچ کی محراب کھلی ہوئی تھی اور اس میں لٹکتا ہوا تسمہ ہوا میں ہلتا ہوا کبھی داہنی طرف چکر کھاتا تھا کبھی بائیں طرف۔ میں نے چلمن کی سمت دیکھا۔ دوسرے دروازے کے قریب حکیم صاحب ایک بوڑھے دیہاتی کی نبض پر ہاتھ رکھے کسی سوچ میں ڈوبے ہوئے تھے۔ میں بیگم کی طرف مڑا۔ ان پر بھی غنودگی طاری تھی لیکن قریب کی کسی صحنچی سے لڑکیوں کی گھٹی گھٹی ہنسی کی آواز آئی تو وہ ہوشیار ہو کر بیٹھ گئیں۔

"کیا مہر آئی ہیں؟" انھوں نے اپنے آپ سے پوچھا اور مجھے اُن کے آسودہ چہرے پر پہلی بار فکر کی ہلکی سی پرچھائیں نظر آئی۔ اسی وقت داہنی طرف والی محراب کا پردہ ہٹا اور ایک نوجوان لڑکی دالان میں داخل ہوئی۔ میں نے اُس کو اچٹتی ہوئی نظر سے دیکھا وہ کسی بے شکن کپڑے کی نارنجی ساری باندھے تھی اور اس کے ناخن نارنجی پالش سے رنگے ہوئے تھے۔ بیگم مجھ سے مخاطب ہوئیں:

"مہر کو پہچانا؟"

میں نے پھر ایک اچٹتی ہوئی نظر اس کے چہرے پر ڈالی۔ اس کے ہونٹوں پر نارنجی لپ اسٹک کی بہت ہلکی تہہ تھی۔ میں نے اس کے سلام کے جواب میں سر کو یوں جنبش دی گویا اُسے بھی دوسری عورتوں کی طرح پہچان گیا ہوں۔ پھر میں نے اس کو غور سے دیکھنے کا ارادہ ہی کیا تھا کہ پردے کے پیچھے سے کسی لڑکی نے اسے دھیرے سے آواز دی اور وہ دالان سے باہر چلی گئی۔

حکیم صاحب اسی طرح بوڑھے دیہاتی کی نبض پر ہاتھ رکھے ہوئے تھے اور بیگم پر پھر غنودگی طاری ہوگئی تھی. میں اٹھ کر کھڑا ہوگیا۔ بیگم نے ادھ کھلی آنکھوں سے میری طرف دیکھا اور میں نے کہا:

"اب اجازت دیجیے۔"

"جاؤ گے؟" انھوں نے بوجھل آواز میں پوچھا اور اچانک مجھے کچھ یاد آگیا۔

"وہ... ڈراونی کوٹھری... اب بھی ہے؟" میں نے پوچھا۔

"ڈراونی کوٹھری..." انھوں نے کہا، کچھ سوچا، پھر افسردگی کے ساتھ مسکرا کر بولیں، "ایک بار تم نے مہر کو اس میں بند کر دیا تھا۔" پھر ان کی مسکراہٹ میں اور زیادہ افسردگی آگئی۔ "چلو تمھیں یہاں کی کوئی شے تو یاد آئی۔"

"اب بھی ہے؟" میں نے پھر پوچھا۔

"وہ کیا ڈیوڑھی کے برابر دروازہ ہے۔ کچھ بھی نہیں، وہاں پہلے باورچی خانہ تھا، دھویں سے دیواریں کالی ہیں۔ ایک دروازہ باہر کی طرف بھی ہے۔ کھلا ہوگا، اس کی کنڈی نہیں لگ پاتی۔"

"میں اُدھر ہی سے نکل جاؤں گا" میں نے کہا، رخصتی سلام کے لیے ہاتھ اُٹھایا اور صحن کی طرف مڑا۔

"اسی طرح کبھی کبھی یاد کر لیا کرو، پہلے تو روز کا آنا جانا تھا۔" انھوں نے لمبی سانس لی اور اُن کی آواز تھوڑی کپکپا گئی، "وقت نے بڑا فرق ڈال دیا ہے، بیٹے۔"

اُن کے ہونٹ ابھی ہل رہے تھے لیکن میں صحن پار کر کے ڈیوڑھی سے متصل دروازے میں داخل ہوگیا۔

(۵)

وہاں کوئی خاص بات نہیں تھی۔ چھت اور دیواروں پر کلونس تھی۔ اس کے

باوجود اندھیرا بہت گہرا نہیں تھا۔ ایک طرف بھوسا ملی ہوئی چکنی مٹی کا بڑا سا چولھا تھا جسے توڑ دیا گیا تھا۔ سامنے روشنی کی ایک کھڑی لکیر نظر آ رہی تھی۔

باہر کا دروازہ، میں نے اپنے آپ کو بتایا اور لکیر کے پاس پہنچ کر اس سے آنکھ لگادی۔ سامنے حکیموں کا چبوترہ دکھائی دے رہا تھا۔ میری پیشانی کو لوہے کی لٹکتی ہوئی زنجیری کنڈی کی ٹھنڈک محسوس ہوئی، میں نے اسے اپنی طرف کھینچا۔ دروازے کا ایک پٹ کھلا، میں نے کنڈی چھوڑ دی، پٹ آہستہ آہستہ بند ہوگیا۔ دو تین مرتبہ یہی ہوا۔ مجھے خیال آیا کہ اس طرح کے دروازوں کو کھولنا اور انھیں اپنے آپ بند ہوتے دیکھنا بچپن میں میرا پسندیدہ کھیل تھا۔ میں نے دونوں پٹ ایک ساتھ اپنی طرف کھینچ کر کھولے اور باہر نکل آیا۔

کچھ دیر بعد میں کھتی اینٹوں والے ایک منزلہ مکان کی پشت پر تھا۔ حکیموں کا چبوترہ اور اس پر کی جھاڑیاں اور قبریں اب اور زیادہ صاف نظر آ رہی تھیں۔ مجھے وہاں کسی چیز کی کمی محسوس ہوئی اور اسی کے ساتھ خیال آیا کہ میں نے چبوترے کو اوپر جا کر نہیں دیکھا، اور اسی وقت مجھے کچھ اور یاد آگیا۔ میں واپس ہوا اور چبوترے کے اوپر آگیا۔

قبروں کی تعداد میرے اندازے سے زیادہ تھی لیکن پتّادر کا وہ جھنڈ غائب تھا جو ایک بہت پرانے سانپ کا مسکن بتایا جاتا تھا۔ جو لوگ اسے دیکھنے کا دعویٰ کرتے تھے ان کا کہنا تھا کہ اس کے پھن پر بال اُگ آئے ہیں۔ بچے پتّادر کے جھنڈ کے پاس کھیلتے رہتے تھے، بلکہ میں تو اُس کے اندر جا چھپتا تھا، لیکن سانپ نے کبھی کسی کو نقصان نہیں پہنچایا تھا۔ شاید اسی وجہ سے یہ بات مشہور تھی کہ وہ کئی پشتوں سے حکیم خاندان کا نگہبان ہے۔ خشک اور سبز پتّادر کے اس جھنڈ کا نقش میرے ذہن میں بالکل تازہ ہوگیا تھا، لیکن یہ مجھے یاد نہ آسکا کہ وہ چبوترے پر کس طرف

تھا جس جگہ اس کے ہونے کا مجھے گمان تھا وہاں پر کئی قبریں تھیں جن پر چونے کی سفیدی چمک رہی تھی۔

چبوترے پر سے میں مکان کے صدر دروازے کو دیر تک دیکھتا رہا۔ میرا جی چاہنے لگا کہ اُس پر دستک دوں، اور میں چند قدم اُدھر بڑھا بھی، لیکن پھر رُک گیا۔ یہ بہت واہیات بات ہوگی، میں نے سوچا اور چبوترے پر سے مکان کے مخالف سمت اُتر گیا۔

واپسی کا راستہ مشکل نہیں تھا، میں بہت آسانی سے اپنے گھر پہنچ گیا۔

# جانوس

The world, unfortunately, is real.

JORGE LUIS BORGES

خرمنے بود مرا، سوختم، اکنون چہ کنم

(طالب علی خاں عیشیؔ)

# جانوس

آندھی کے آثار تھے۔ دور شمال کی طرف آسمان زیادہ تاریک ہو گیا تھا اور فضا میں ہلکی سنسناہٹ تھی۔ ہوا کی رفتار تیز ہو چکی تھی لیکن ابھی اس میں ناہمواری نہیں آئی تھی۔

اُس رات بھی مجھ کو نیند نہیں آ رہی تھی مگر میں نے بستر پر لیٹ کر بجلی بجھا دی۔ کمرے کا مشرقی دروازہ کھلا ہوا تھا اور کمرے میں باہر سے زیادہ اندھیرا تھا اس لیے باہر کا اندھیرا کمرے کے اندر روشنی۔ بہت مدّھم، مگر روشنی۔ کی طرح داخل ہو رہا تھا۔ میری چوتھی کروٹ نے پھر میرا منھ مشرقی دروازے کی طرف کر دیا۔ دروازے سے دو قدم آگے کھلے آسمان کے نیچے میرا اندآدر کتا بُت بنا بیٹھا تھا۔ میں دیر تک اس کی طرف دیکھتا رہا۔ آندھی کے آثار شروع ہوتے ہی کتّے کے کان رہ رہ کر پھڑکنے لگے تھے۔ وہ عام کتوں سے بہت بڑا تھا۔ مجھ کو یہ سوچ کر ہنسی آئی کہ دو سال پہلے میں اسی کتے کو اپنے اوورکوٹ کی جیب میں رکھ کر لایا تھا۔

"ہاؤنڈ!" میں نے آہستہ سے کتے کو پکارا۔

کتے نے بیٹھے بیٹھے دو تین مرتبہ دُم ہلائی۔

"ہاؤنڈ!"

کتا اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ اس نے اپنی جگہ پر کئی چکّر کاٹے، پھر ذرا آگے بڑھ کر

دروازے سے اپنا بدن رگڑنے لگا۔ اسے کمرے کے اندر داخل ہونے کی اجازت نہیں تھی۔

"بیٹھ جاؤ، شاباش!"

کتے نے پھر دو تین چکر کاٹے اور اس بار دروازے سے لگ کر بیٹھ گیا۔ مجھ کو اپنا کمرا بہت محفوظ معلوم ہونے لگا اور اب میری آنکھوں پر نیند کی پہلی باریک جھلی سی منڈھ گئی۔ میں نے داہنی کروٹ لے کر دروازے کی طرف پیٹھ کر لی۔ سر کے نیچے ہاتھ ہٹالیا اور میرے خیالات بے ربط ہو گئے۔ یہ نیند کی علامت تھی۔ میں نے آنکھیں کھولیں اور بند کر لیں۔ لیکن جب میرے خیالوں کی بے ربطی مہملیت کی حد کو پہنچ چکی تھی اور یہ مہمل خیال بھی مجھے اپنے ذہن کے اندھیرے میں ڈوبتے معلوم ہو رہے تھے اس وقت مجھ کو آندھی کی آواز بہت قریب سنائی دی۔

آندھی آرہی ہے، میں نے سوچا، پھر یہ خیال بھی واہیات ہوتا ہوا ڈوب رہا تھا کہ میری پشت پر کتا گرج دار آواز میں بھونکا۔ مجھ کو ایسا محسوس ہوا جیسے میری آنکھوں اور ذہن اور جسم پر کھالیں سی کھینچ لی گئی ہوں۔ میں نے تڑپ کر دروازے کی طرف کروٹ لی۔ مجھ کو کتے پر غصہ آگیا تھا لیکن کتا اب اپنی جگہ پر نہیں تھا۔ وہ بھونکتا ہوا نیچے جارہا تھا اور اس کی زینہ بہ زینہ اترتی ہوئی آواز سے ظاہر تھا کہ اسے کوئی آہٹ ملی ہے اور وہ سیدھا اس آہٹ کی طرف جارہا ہے۔ اسی وقت کھلے ہوئے دروازے کے باہر غبار کی ایک چادر سی گری اور باہر کا اندھیرا بھی گہرا ہونے لگا۔

"ہوا!" میں نے اپنے آپ سے کہا، "لیکن میں عناصر سے مرعوب نہیں ہوں۔"

نیچے سے پھر کتے کی آواز آئی، لیکن اس بار اس کی آواز بیٹھی ہوئی سی تھی اور اس میں اس کی مخصوص ہوک بھی شامل تھی۔

اس نے کچھ دیکھ لیا ہے، میں نے سوچا، اسی کے ساتھ آندھی نے غراہٹ کے

ساتھ کمرے کے شمالی دروازے پر ٹکر ماری اور دروازے کے اوپر والا روشن دان کھل گیا کچھ سوکھے پتے روشن دان سے داخل ہو کر کمرے کی جنوبی دیوار سے ٹکرائے اور ہلکی کھڑکھڑاہٹ کے ساتھ دیوار سے گھستے ہوئے نیچے فرش پر آگرے۔ ان سب آوازوں پر کتے کی آواز حاوی تھی۔ وہ لگاتار بھونک رہا تھا اور ہر بار اس کی ہوک زیادہ لمبی ہوتی جا رہی تھی۔ میرا خیال تھا کہ وہ ہوا سے لڑ رہا ہے، لیکن اچانک مجھے شبہ ہوا کہ میں نے ایک انسانی آواز بھی سنی ہے۔ کتے کی آواز اور تیز ہو گئی۔ میں نے کانوں پر زور دیا۔ شک کی گنجائش نہیں تھی۔ ایک گھٹی گھٹی سی لیکن بھاری آواز کتے کو چپ کرانا چاہ رہی تھی۔

میں بستر سے کود پڑا۔ میں بلڈ ہاؤنڈ کی مضرتوں سے واقف تھا۔ اس وقت آنے والا کون ہو سکتا ہے۔ میں نے یہ نہیں سوچا اس لیے کہ نیچے جو کوئی بھی تھا اس کی زندگی خطرے میں تھی۔ مجھ کو ابھی ابھی یاد آیا تھا کہ میں نے آج برآمدے میں کھلنے والا دروازہ بند نہیں کیا ہے اور چمن کے باہر کھلنے والا سلاخوں دار پھاٹک بھی ابھی تک کھلا ہوا ہے۔ میں نے پاؤں سے اپنی چپلیں ٹٹولیں اور پیروں کو اُن میں بٹھاتا ہوا تیزی سے زینے اُترنے لگا۔

"ہاؤنڈ!" میں زور سے چیخا، "نہیں، ہاؤنڈ!!"

نیچے برآمدے میں پہنچ کر میں نے پھر کتے کو آواز دی۔ پھاٹک سامنے نظر آ رہا تھا۔ کسی نے اسے بند کر دیا تھا۔ آندھی ابھی زمین کی طرف نہیں جھکی تھی اور اوپر کے مقابلے میں یہاں ہوا کا زور کم تھا، پھر بھی چمن کے درخت بار بار جھک رہے تھے اور ہوا اُن کی شاخوں میں الجھ رہی تھی۔ پھاٹک کے باہر فضا بہت روشن تھی اس لیے کہ سامنے حاجی زین الدین کی کوٹھی کے احاطے میں اسی ہفتے تیز دودھیا روشنی کا بلب لگایا گیا تھا۔ پھاٹک کی سلاخوں کے سائے لمبے ہو کر برآمدے کی سیڑھیوں تک پہنچ رہے تھے۔ ان سیاہ دھاریوں کے بیچ میں کتا پچھلی ٹانگوں سے مٹی اڑا اڑا کر مسلسل بھونکے جا رہا تھا۔ میں نے اسے

آواز دی۔ اس نے پیچھے مڑکر دیکھا۔ دو تین چھلانگوں میں وہ میرے پاس پہنچ گیا اور پھیر گرگھبد چکمکات کر پھر واپس جانے لگا، لیکن میں نے بڑھ کر اس کا پٹا پکڑ لیا۔

"کون ہے؟" میں نے پکار کر پوچھا۔ میری نظریں پھاٹک کے باہر جمی ہوئی تھیں۔ کتا پھاٹک کی طرف جانے کے لیے زور لگا رہا تھا۔ میں برآمدے کی سیڑھیاں اتر کر کچھ دور تک اس کے ساتھ آگے بڑھا۔

"کون صاحب ہیں؟" برآمدے اور پھاٹک کے درمیان رک کر میں نے پھر پکارا۔ لیکن پھاٹک کے باہر کوئی نہیں تھا۔ پھر بھی میں پھاٹک تک گیا اور کچھ دیر تک اُس کی سلاخوں پر ہاتھ پھیرتا رہا۔ پھر میں کتے کی طرف مڑا۔

"آؤ دوست، واپس چلیں"، میں نے کتے سے کہا۔ "کوئی آیا ضرور تھا مگر تمھاری وجہ سے پھاٹک بند کر کے چلا گیا۔"

میں کتے کو پکڑے پکڑے برآمدے کی طرف واپس ہونے لگا۔ بائیں ہاتھ کے درخت کی شاخوں سے تازہ پتے زمین پر گر کر ناچ رہے تھے۔ میں نے اوپر دیکھا۔ پتلے تنے والا درخت بہت اونچا تھا اور اس کی چوٹی ہوا کی زد میں تھی۔ مجھ کو اندیشہ ہوا کہ کہیں آندھی اس کو نقصان نہ پہنچا دے، پھر مجھے خیال آیا کہ ایسی آندھیاں سال میں کئی مرتبہ آتی ہیں اور درخت انھیں جھیل لے جاتا ہے۔

زمین پر پتے اِدھر اُدھر دوڑے اور میں نے برآمدے کی طرف قدم بڑھایا، لیکن مجھے ٹھٹھک کر رُک جانا پڑا۔ زمین پر پھاٹک کی سیاہ دھاریوں کے درمیان ایک نیا سایہ نمودار ہو گیا تھا۔ میں نے کتے کے پٹے پر گرفت مضبوط کر لی اور گردن موڑ کر پیچھے دیکھا۔ باہر پھاٹک کی سلاخوں سے لگا ہوا کوئی کھڑا تھا۔ پیچھے سے پڑتی ہوئی تیز روشنی میں وہ خود بھی کوئی پرچھائیں معلوم ہو رہا تھا۔ وہ دونوں ہاتھوں میں کچھ سامان سنبھالے ہوئے تھا اور ایک ایسا سیاہ مجسمہ نظر آتا تھا جس کی کمر سینے سے دگنی چوڑی ہو۔

"کون؟" میں نے اپنی جگہ سے ہٹے بغیر پوچھا اور کتے کا پٹا میرے ہاتھ سے چھوٹ گیا۔ کتا بھونکتا ہوا پھاٹک کی طرف جھپٹا۔ مجسمہ تیزی سے کئی قدم پیچھے ہٹ گیا۔ میں نے بڑھ کر پھر کتے کا پٹا پکڑ لیا۔

"کون صاحب ہیں؟" میں نے پھر پکار کر پوچھا۔ لیکن جواب ملنے سے پہلے ہی آندھی زمین پر جھک آئی۔ پھاٹک کے باہر کی بھربھری مٹی پر ہوا کا پہلا طمانچہ پڑا۔ غبار کا ایک بھنور سا اٹھا اور مجسمہ اس کے پیچھے چھپ گیا۔ اِدھر اُدھر سے کئی بگولے دوڑتے ہوئے آئے اور اس بھنور کے ساتھ مل کر ناچنے لگے۔ ہوا ناہموار ہو چکی تھی۔ ایک اور جھونکے نے غبار کو سامنے سے ہٹایا تو مجسمہ پھاٹک سے لگا نظر آیا۔ اس کے بال لمبے تھے اور ہوا سے اُڑ رہے تھے۔

"کون صاحب ہیں؟" میں نے ہاتھ بڑھا کر پھاٹک تھوڑا سا کھول دیا۔

"اندر آجائیے۔"

مگر پھاٹک کھلتے ہی مجسمہ پھر بھڑک کر پیچھے ہٹ چکا تھا، اور اب آندھی کا شور اتنا تھا کہ مجھ کو خود اپنی آواز مشکل سے سنائی دے رہی تھی۔

"اندر کیوں نہیں آتے؟" میں نے چیخ کر کہا اور اس بار مجھ کو جواب بھی ملا۔

"کتے کو روکے رہیے۔"

"کتا نہیں بولے گا، اندر آجائیے۔"

میں کتے کو پکڑے پکڑے برآمدے کی طرف بڑھنے لگا۔ زمین پر پھاٹک کی سیاہ دھاریوں کے درمیانی فاصلے کم ہو گئے۔ میری پشت پر نووارد آہستہ آہستہ آگے بڑھ رہا تھا۔ برآمدے کی سیڑھیاں چڑھ کر میں ٹھہر گیا۔ اب نووارد میرے برابر آ چکا تھا۔ حاجی زین الدین کے یہاں کی روشنی برآمدے تک آتے آتے پھیکی پڑ گئی تھی، مگر یہ پھیکی روشنی بھی یہ ظاہر کرنے کے لیے کافی تھی کہ آنے والا

بہت خستہ حال شخص ہے۔ اس کا لباس تک سالم نہیں تھا۔ اس کا رنگ اتنا کالا تھا کہ برآمدے کی مدھم روشنی میں اس کے ناک نقشے کا ٹھیک پتا نہیں چلتا تھا۔ اس کے ایک ہاتھ میں رسّی سے لپٹا ہوا ایک بستر تھا اور دوسرے ہاتھ میں ٹین کا کنستر جس میں کبھی بناسپتی گھی رہا ہوگا لیکن اب ٹین کا کنارے دار ڈھکنا اور کنڈی لگا کر اس کو زیادہ کار آمد بنا لیا گیا تھا۔ وہ میری طرف متوجہ نہیں تھا۔ اس کی نظریں کتّے پر جمی ہوئی تھیں۔

"کہاں سے آئے ہو؟" میں نے پوچھا۔

"یہ کاٹے گا تو نہیں؟"

"نہیں۔ کہاں سے آئے ہو؟"

"ڈاکٹر صاحب سے ملنا تھا۔"

"میں ہی ہوں۔"

اب اس نے مجھ کو سلام کیا۔ سلام کا انداز شائستگی سے خالی نہیں تھا۔

"حضور ڈاکٹر صاحب"، اس نے ذرا رک کر کہا، "مجھے جان محمد نے آپ کے پاس بھیجا ہے۔"

"جان محمد؟"

"جو پارسال آپ کے دواخانے میں نوکر تھا۔ مجھے وہ کان پور میں ملا تھا۔"

"جان محمد کان پور میں کیا کر رہا ہے؟ آؤ، اندر آ جاؤ۔"

میں نے برآمدے سے ملحق ڈرائنگ روم کا دروازہ کھول کر بلب روشن کر دیا۔

"ہوٹل میں نوکر ہے"، نووارد دروازے میں داخل ہوتے ہوئے بولا۔

بجلی کی تیز روشنی میں وہ اور زیادہ خستہ حال معلوم ہو رہا تھا، اور ڈرائنگ روم کی آرائش نے اس کی شکستگی کو اس قدر نمایاں کر دیا تھا کہ میں اس سے صوفے پر بیٹھنے

کو کہتے کہتے رک گیا۔ اس کے پائجامے کی مہریاں کئی جگہ سے پھٹی ہوئی تھیں اور قمیص کی آستینیں گھس گئی تھیں۔ اس کے بالوں کے گچھے کندھوں سے کچھ اوپر جھول رہے تھے۔ چھوٹی مگر گھنی داڑھی اس کی سیاہ جلد میں مل کر اس کے چہرے کو اور بڑا دکھا رہی تھی۔ چوڑی ہڈی اور لمبے قد کا وہ خستہ حال آدمی یقیناً مرعوب کر دینے والی شخصیت کا مالک تھا۔ کچھ دیر خاموش رہنے کے بعد اُس نے گفتگو کا سلسلہ جوڑا:

"جان محمد نے آپ کو سلام کہا ہے اور بغیر کہے نوکری چھوڑ دینے کی معافی مانگی ہے حضور ڈاکٹر صاحب، وہ آدمی برا نہیں ہے۔ آپ کے تیس رُپے اُس پر نکلتے تھے، وہ اس نے میرے ہاتھ بھجوائے ہیں۔" اس نے پائجامے کے نیفے میں سے ایک کاغذ میں لپٹے ہوئے نوٹ نکال کر مجھ کو دے دیے۔ "اُس نے کہا تھا لکھنؤ پہنچتے ہی ڈاکٹر صاحب کو رپے دے دینا۔ اسی لیے ناوقت آپ کو تکلیف دی۔"

مجھ کو جان محمد کی ایمان داری پر ذرا حیرت ہوئی۔

"حضور، کتے کو روک لیں تو میں چلا جاؤں۔"

"ابھی آندھی تیز ہے۔ کچھ دیر بیٹھ جاؤ۔" میں نے صوفے کی طرف اشارہ کیا۔

"حضور کو زحمت ہو رہی ہوگی۔"

"نہیں، کوئی بات نہیں"۔ میں نے اُسے پھر صوفے پر بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ نووارد کچھ دیر ہچکچانے کے بعد بڑے صوفے کے سرے سے ٹک گیا۔ اس کا سامان اس کے ہاتھ میں تھا۔ اب اُس نے بستر اپنے زانوؤں پر اور کنستر سامنے جوٹ کی چٹائی پر رکھا اور پہلی بار کمرے میں چاروں طرف نظر دوڑائی۔ میری نگاہیں اس پر جمی ہوئی تھیں۔ اُس شخص میں کوئی بات تھی جو میری سمجھ میں نہیں آ رہی تھی۔

"تم جان محمد کو کیوں کر جانتے ہو؟"

"ہم دونوں ایک ہی ہوٹل میں کام کرتے تھے۔"

"تم بھی ہوٹل میں کام کرتے ہو؟"

"اب الگ ہو گیا ہوں۔"

"اب کیا کرتے ہو؟"

وہ کچھ دیر خاموش رہا، پھر اس کی گردن جھک گئی اور آواز دھیمی ہو گئی۔

"جان محمد نے کہا تھا اپنے لیے بھی ڈاکٹر صاحب سے بات کرنا وہ کوئی کام ضرور دلوا دیں گے۔"

"کان پور سے چلے کیوں آئے؟"

"دل نہیں لگا۔"

"کہاں کے رہنے والے ہو؟"

"یہیں لکھنؤ کا۔ سات برس باہر رہا، لیکن حضور ڈاکٹر صاحب، لکھنؤ والے کا اور کہیں دل بھی تو نہیں لگتا۔"

"یہاں تمھارا مکان کہاں ہے؟"

"اب کہیں نہیں۔ خاندانی مکان لڑکپن ہی میں ہاتھ سے نکل گیا تھا۔ والد صاحب کا انتقال آغا میر کی سرائے میں ہوا۔ والدہ مجھے لیکر ٹوریا گنج کے خیرات خانے میں اٹھ آئیں۔ وہ بھی گزر گئیں تو میں شہر چھوڑ کر نکل گیا۔"

یہاں پہنچ کر وہ سیاہ فام شخص اونگھ گیا۔ وہ کچھ اور بھی بڑبڑایا تھا جو میری سمجھ میں نہیں آیا، البتہ "نواب سہراب کی حویلی" کے لفظ میرے کان میں پڑے اور میں نے پوچھا:

"نواب سہراب کی حویلی کیا؟"

"حضور ڈاکٹر صاحب"، نووارد نے ہوشیار ہو کر کہا "نواب سہراب کی حویلی تو بہت بدل گئی۔"

"ہاں، اُس کو منظور صاحب نے خرید کر ٹھیک کروایا ہے۔"

"یہ منظور صاحب۔۔۔" اس نے کچھ سوچتے ہوئے پوچھا، "نواب ہیں؟ نواب منظور علی خاں؟"

"نہیں، تاجر ہیں۔ منظور شاہ نام ہے۔"

"لکھنو ہی کے ہیں؟"

"مجھے ٹھیک معلوم نہیں۔"

"کاہے کے تاجر ہیں؟"

"یہ بھی ٹھیک نہیں معلوم۔"

اس کے بعد دیر تک خاموشی رہی اور باہر تیز ہوا کی ہلکی ہلکی آواز سنائی دیتی رہی۔

"یہ نواب سہراب کی حویلی۔۔۔" نودار دکہتے کہتے رُکا، پھر بولا، "ہماری تھی۔"

میں نے ذرا حیرت سے اس کی طرف دیکھا۔

"پھر ہمارا وقت بگڑ گیا،" اس نے سپاٹ لہجے میں کہا، "والد صاحب کی زندگی حویلی میں گزری مگر انتقال آغا میر کی سرائے میں ہوا۔ مجھے یاد بھی نہیں حویلی کے اندر گیا تھا۔ والدہ بتاتی تھیں۔۔۔" یہ کہتے کہتے وہ پھر اونگھ گیا اور اس کا سر جھکنے لگا۔

میں چپ چاپ اس کی طرف دیکھتا رہا۔

"حضور ڈاکٹر صاحب،" اس نے پھر ہوشیار ہو کر اپنا جھکتا ہوا سر اُٹھایا، "آندھی کا زور گھٹ گیا ہے۔ کتے کو روک لیجئے۔ کل جس وقت حکم دیجئے حاضر ہو جاؤں۔"

مجھ کو محسوس ہوا کہ اس کی بھاری آواز اچانک کھو کھلی سی ہو گئی ہے۔ مجھے یہ بھی محسوس ہوا کہ وہ مجھ سے نظریں چرا رہا ہے اور مجھ کو اپنی طرف دیکھتے دیکھ کر پریشان

ہو رہا ہے۔

"حضور کی مہربانی سے کوئی کام مل جائے تو..." اس نے بستر کو داہنے ہاتھ میں دبایا، سامنے رکھے ہوئے کنستر کو بائیں ہاتھ سے اٹھا کر صوفے سے اٹھنا چاہا مگر نہ اٹھ سکا۔ دوسری کوشش میں بھی نہ اٹھ سکا۔ آخر تیسری بار اس نے جھٹکے سے خود کو اٹھایا اور اس کے منھ سے ہلکی سی آواز نکلی جسے اس نے فوراً ہونٹ بھینچ کر روک لیا۔

اب میں نے دیکھا کہ اس شخص کا بدن کانپ رہا ہے۔

"کیا بات ہے؟" میں نے اٹھ کر اس کی طرف بڑھتے ہوئے پوچھا۔

"جی؟" اس نے قدرے گھبرا کر پوچھا۔

"تم کانپ رہے ہو۔"

"جی نہیں تو۔"

"بیٹھ جاؤ، تمھاری طبیعت ٹھیک نہیں ہے۔"

"میں بالکل ٹھیک ہوں۔ حضور ڈاکٹر صاحب، کتے کو روک لیجیے۔" اس نے کسی ضدی بچے کی طرح کہا۔

پھر میں نے یہی مناسب سمجھا کہ اسے جانے دیا جائے۔ میں نے دروازے کے قریب جا کر کتے کو اوپر جانے کا اشارہ کیا۔ کتے نے فوراً تعمیل کی۔ میں نودارد کی طرف مڑا۔

"ٹھیک ہے،" میں نے کہا۔ "کل صبح نو بجے مطب میں آ جانا۔"

نودارد نے مجھ کو سلام کیا اور دروازے سے باہر نکل کر برآمدے میں آ گیا، ایک نظر اوپر کے زینوں کی طرف دیکھا اور برآمدے کی سیڑھیاں اتر گیا۔ چند لمحوں میں اس کا سایہ بھی برآمدے سے غائب ہو گیا۔

میں نے بلب بجھانے کے لیے سوئچ کی طرف ہاتھ بڑھایا ہی تھا کہ باہر ایک دھماکا سا

ہوا۔ اور ابھی میں اس آواز کو سمجھ بھی نہ پایا تھا کہ زینے پر سے کتے کی گرج سنائی دی اور اس کے ساتھ کتا برآمدے سے اُڈ کر چمن کی طرف جاتا دکھائی دیا۔ میں بھی فوراً باہر نکل کر برآمدے سے نیچے اُتر آیا۔ سامنے پھاٹک کی سلاخوں کے سائے میرے قدموں تک آرہے تھے اور مجھ سے دس پندرہ قدم آگے وہ شخص ایک سیاہ ڈھیر کی طرح زمین پر پڑا ہوا تھا۔ اس کے گرنے سے غبار کا ایک چھوٹا سا بادل اٹھا تھا جو ابھی تک اُس پر منڈلا رہا تھا اور حاجی زین الدین کے یہاں کی روشنی اس کی وجہ سے کچھ دھندھلا گئی تھی۔ کتا خاموش مگر بے قراری کے ساتھ اس بے حرکت پڑے ہوئے انسان کو ہر طرف سے سونگھ رہا تھا۔ مجھ کو دیکھتے ہی کتا میری طرف لپکا، منھ سے کچھ باریک آوازیں نکالیں اور پھر اُس جسم کی طرف دوڑ گیا۔ میرے وہاں تک پہنچتے پہنچتے وہ ہم دونوں کے درمیان کئی چکر لگا چکا تھا۔

میں اُس کے قریب پہنچ کر جھکا۔ وہ زمین پر اوندھا پڑا ہوا تھا۔ بستر اُس کے ہاتھ سے چھوٹ گیا تھا لیکن کنستر کا کنڈا ابھی تک اس کی انگلیوں میں پھنسا ہوا تھا۔ کنستر کا ڈھکنا کھل گیا تھا اور روشنی سیدھی اُس کے اندر داخل ہو رہی تھی۔ کنستر خالی تھا۔ زمین پر پڑے ہوئے آدمی کا داہنا ہاتھ آگے کی طرف پھیلا ہوا تھا اور اس کی مٹھی اس طرح بھنچی ہوئی تھی جیسے اُس نے زمین کو پکڑ رکھا ہو۔ پھر اس کا ہاتھ ہلا اور بدن دو تین بار ہلا۔ اس نے کنستر کو چھوڑ کر دونوں ہاتھ ٹیک کے زمین پر زور دیا اور اٹھنے کی کوشش کی۔ اُس کا سر اور کندھے دو بالشت اوپر اٹھے پھر زمین سے لگ گئے۔ اس نے دوبارہ اُٹھنے کی کوشش کی اور میں نے ایک گھٹنا جھکا کر اس کے دونوں بازو پکڑ لیے۔ ذرا سی کشمکش کے بعد وہ اٹھ کھڑا ہوا۔ لیکن اس کی ٹانگوں میں دم نہیں تھا۔ اس نے جھک کر ایک ہاتھ سے کنستر کو پکڑا اور پھر بیٹھ گیا۔

"چکر آرہا ہے"۔ اس نے بظاہر اپنے آپ کو بتایا۔ اب اُس کی آواز بہت کھوکھلی

ہو چکی تھی۔ میں نے اس کی کمر میں ہاتھ دے کر اسے اٹھایا۔ کنستر بھی کچھ دور تک اوپر اٹھا، پھر چھوٹ کر زمین پر گر گیا۔ کتّا جو مستقل ہم دونوں کے گرد چکر کاٹ رہا تھا، لپک کر قریب آیا اور کنستر کو سونگھنے لگا۔

"چکرّا گیا تھا"، نووارد نے مجھ کو بتایا۔

میں اس کو سہارا دیے دیے برآمدے کی سیڑھیوں تک لایا۔ سیڑھیاں پڑھتے ہوئے اس شخص پر بے ہوشی طاری ہونے لگی اور جب تک میں اُس کو ڈرائنگ روم کے صوفے پر لٹاؤں وہ بالکل غافل اور بے حرکت ہو چکا تھا۔ مجھ کو اُس کے زندہ ہونے میں شک تھا۔ اس کا سیاہ چہرہ اور بال گرد سے اَٹ گئے تھے۔ اُس کے داہنے ہاتھ کی مٹھی کھل گئی تھی اور اُس میں سے مٹی نکل کر جوٹ کی چٹائی پر گر رہی تھی۔

میں نے اس کی نبض پر ہاتھ رکھا، پھر تیزی سے اوپر گیا۔ کتّا بھی میرے پیچھے ہو لیا۔ اوپر سے اسٹیتھوسکوپ لے کر میں واپس نیچے آیا۔ ڈرائنگ روم کا دروازہ اندر سے بند کر کے میں مڑا۔ نووارد اب بھی صوفے پر بے حرکت پڑا ہوا تھا۔ میں نے اس کا معائنہ کیا اور اس معائنے کے بیچ میں اس نے آنکھیں کھول دیں۔ لیکن یہ آنکھیں شیشے کی سی تھیں اور اُن میں کچھ نہیں تھا۔ میں نے اس کے چہرے کو غور سے دیکھا۔ اُس کے خدوخال اچھے تھے۔ اس کی آنکھوں کے گرد باریک جھرّیاں تھیں۔ اگر یہ جھرّیاں اُس کے سیاہ رنگ میں دب نہ گئی ہوتیں تو وہ زیادہ معمّر معلوم ہوتا۔ اس کی آنکھیں اس کے چہرے پر نمایاں تھیں اور اس حالت میں ایک لاش کی طرح پڑا ہوا وہ بہت مطمئن اور آسودہ حال معلوم ہو رہا تھا۔ لیکن دھیرے دھیرے اس کی آنکھوں میں ہوش جھلکنے لگا۔ اس کی پلکیں تھرتھرائیں۔ اس نے مجھ کو پہچاننے کی کوشش کی اور پہچان لیا۔ پھر اس نے اٹھنا چاہا اور اس کی آنکھوں سے کرب ظاہر ہونے لگا۔ میں نے اس کے سینے پر آہستہ سے ہاتھ رکھ کر اُسے اٹھنے سے روکا۔

"لیٹے رہو" میں نے کہا، "کیا تکلیف ہے؟"

"میں جاؤں گا"، اس نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا اور پھر اٹھنا چاہا۔

"ابھی تمھاری طبیعت ٹھیک نہیں ہے" میں نے اسے بتایا اور اپنا سوال دُہرایا۔ "کیا تکلیف ہے؟"

"تھکن، چکر اور..." وہ رک گیا۔ پھر بولا، "بہت تکلیف ہے"

میں معائنہ ختم کر چکا تھا۔

"اچھا لیٹے رہو" میں نے کہا، "دوا دیتا ہوں۔ ٹھیک ہو جاؤ گے"

میں نے دروازے کا ہینڈل گھمایا۔ دروازہ کھولنے سے پہلے میں نے سر گھما کر ایک نظر مریض کو دیکھا اور میرا ہاتھ ہینڈل پر رکھا رہ گیا۔ باہر سے دروازے پر دباؤ پڑا۔ دروازہ تھوڑا کھل گیا۔ کتے کا سر اندر داخل ہوا اور ہوا کی آواز صاف سنائی دینے لگی میں مڑا اور تیز قدموں سے مریض کے سرھانے پہنچا۔

"سنو"، میں نے مریض پر جھک کر آہستہ سے پوچھا، "آج تم نے کیا کھایا تھا؟"

"کچھ نہیں"

"کل؟"

مریض خاموش رہا۔

"کل تم نے کچھ کھایا تھا؟"

مریض پھر خاموش رہا۔

"کب سے بھوکے ہو؟" میں نے ذرا درشتی سے پوچھا۔

میری آواز بظاہر مریض کو سنائی نہیں دی۔

"تم کب سے بھوکے ہو؟" میں نے اپنا سوال دُہرایا۔

مریض کی آنکھیں بے نور ہو چکی تھیں لیکن وہ ہوش میں تھا۔ اس کے اور

ہونٹ بھینچے ہوئے تھے۔ اب میں نے بہت نرم لہجے میں اُس سے پوچھا:
"تم نے کب سے کچھ نہیں کھایا ہے؟"
مریض نے کوئی جواب نہیں دیا۔
دروازے کے اندر منھ ڈالے کتا ہانپ رہا تھا اور باہر ہوا ٹین کے خالی کنستر کو اِدھر سے اُدھر لڑھکاتی پھر رہی تھی۔ میں کچھ دیر خاموش کھڑا رہا۔ پھر اوپر آگیا۔ اپنے کمرے میں پہنچ کر میں نے سوچنے کی کوشش کی کہ مجھے کیا کرنا ہے۔ میں نے اپنے بستر پر بیٹھ کر تکیے سے ٹیک لگا لی اور ذہن پر زور دینے لگا۔ مجھے چپلیں اپنے پیروں سے نکلتی محسوس ہوئیں۔

شمالی روشن دان میں سے گرتے ہوئے سوکھے پتّوں کی کھڑکھڑاہٹ سے میری آنکھ کھلی۔ میں اٹھ بیٹھا اور چپلیں پہنتا ہوا نیچے اترا۔ ڈرائنگ روم کا دروازہ باہر سے بند تھا۔ میں نے دروازہ کھول کر اندر جھانکا۔ پھر میں برآمدے کے کھلے ہوئے دروازے سے نیچے اُترا۔ سلاخوں دار پھاٹک بھی کھلا ہوا تھا۔ میں نے پھاٹک بند کر دیا اور کچھ دیر وہیں کھڑا رہا۔ آندھی تیز ہو گئی تھی۔ مجھ کو اپنے پیروں کے پاس کتّے کی موجودگی کا احساس ہوا۔
"آؤ دوست، واپس چلیں"۔ میں نے کتّے سے کہا اور برآمدے کی طرف مڑ گیا۔ برآمدے کا دروازہ بند کر کے میں اوپر اپنے کمرے میں پہنچا۔
بستر پر لیٹتے ہی میرے خیالات بے ربط ہو گئے۔ ایک خیال میری زبان پر آیا:
"وہ بھی عناصر سے مرعوب نہیں تھا"۔ پھر یہ خیال طرح طرح کی مہمل شکلیں

اختیار کرنے لگا۔

"پھر بھی جانوں، تم نے انتظار نہیں کیا،" میں نے کہا اور سو گیا۔

# سلطان مظفر کا واقعہ نویس

At least, not in this continuum...

H. BEAM PIPER

دیدیم، تپیدیم، نہ دیدیم تپیدیم
(اقبال)

# سلطان مظفر کا واقعہ نویس

(۱)

اب، جب کہ سلطان مظفر کے مقبرے کو اس کی زندگی ہی میں اتنی شہرت حاصل ہو گئی ہے کہ دور دور سے لوگ اسے دیکھنے آتے ہیں، مجھ کو حکم ہوا ہے کہ اس کی تعمیر کا واقعہ لکھوں۔ اس حکم کے ساتھ میری خانہ نشینی کا زمانہ ختم ہوتا ہے۔

یہ بات کہ سلطان کا مقبرہ تعمیر ہو گیا ہے، مجھے سلطان ہی سے معلوم ہوئی۔ اور جب سلطان نے مجھ کو یہ بتایا کہ اس کا مقبرہ اس وادی میں نہیں بنایا گیا ہے جہاں اس کے اجداد کے مقبرے ہیں تو میں سمجھ گیا کہ مقبرہ صحرا میں ہوگا۔ اس لیے کہ میں اس کی صحرائی مہم کا واقعہ نویس تھا۔ اور جب اس نے یہ بتایا کہ مقبرہ ایک اونچی عمارت ہے تو میں نے سمجھ لیا کہ یہ عمارت بغیر چھت کی ہوگی، یہ بھی اس لیے کہ میں سلطان کی صحرائی مہم کا واقعہ نویس تھا۔ وہ میری آخری واقعہ نویسی تھی۔ اسی کے بعد میری خانہ نشینی کا زمانہ شروع ہوا تھا۔

اس زمانے کی بہت سی باتیں میں بھول چکا ہوں لیکن اپنی خانہ نشینی کا پہلا دن مجھے اتنی اچھی طرح یاد ہے کہ اس کا حال میں ایک مستند واقعہ نویس کی طرح لکھ سکتا ہوں۔

اُس دن صبح کی سیر میں مجھے مقبروں والی وادی کے کنارے چھوٹے چھوٹے پودے پڑے نظر آئے تھے جنھیں شاید تھوڑی ہی دیر پہلے زمین سے اکھاڑ کر پھینکا گیا تھا۔ یہ چھتری کی شکل کے ان بڑے درختوں کے پودے تھے جن کی قطاروں نے وادی کو گھیرے میں لے رکھا تھا۔ مجھے ان درختوں کا نام نہیں معلوم تھا لیکن میں نے کبھی کبھی ان کے نیچے آرام کیا تھا۔ ان کے تنے سفیدی مائل اور شاخیں گھنی تھیں اور ان کے سائے میں نیند آتی تھی۔ میں نے زمین پر پڑے ہوئے پودوں کو غور سے دیکھا۔ ان میں سے دو کی جڑیں سلامت تھیں۔ انھیں احتیاط سے اٹھا کر میں نے ان کی جڑوں پر بڑے درختوں کے نیچے کی مرطوب مٹی چڑھا دی اور اپنے گھر کا رُخ کیا۔ گھر پہنچتے پہنچتے میں فیصلہ کر چکا تھا کہ انھیں اپنے باغ میں کہاں پر لگاؤں گا۔ میں راستے میں رُکا نہیں، البتہ ایک چھوٹی جھیل کے کنارے سے گزرتے ہوئے میں نے جھک کر تھوڑا پانی چلو میں لیا اور پودوں کی پتیوں پر چھڑک دیا۔ میرا اندازہ ہے کہ ٹھیک اُسی وقت سلطان کا گماشتہ میرے گھر کی طرف روانہ ہوا ہوگا۔

میں اپنے باغ میں دونوں پودوں کو بٹھا چکا تھا اور انھیں دھوپ سے بچانے کی تدبیریں کر رہا تھا۔ ان میں سے ایک کے گرد میرے گھر کے بچوں نے گھیرا ڈال رکھا تھا۔ وہ اپنے کھیلنے کی چھوٹی چھوٹی چیزوں سے باری باری اس پر سایہ کر رہے تھے اور اس نئے کھیل سے اس قدر خوش تھے کہ اپنی اپنی باری کے لیے جھگڑ رہے تھے۔ میں دوسرے پودے کی پتیوں پر پانی کے چھینٹے مار رہا تھا کہ اس پر سلطان کے گماشتے کی پرچھائیں پڑی۔ میں نے پرچھائیں کو پہلے، گماشتے کو بعد میں دیکھا۔ بچوں نے پودے کو چھوڑ کر گماشتے کے گرد گھیرا ڈال دیا لیکن کچھ دیر تک اس کے لباس کو غور سے دیکھنے کے بعد وہ اس سے ڈر گئے اور بھاگ کر گھر کے اندر جا چھپے۔ میں نے بھی اس کے لباس کو غور سے دیکھا اس لیے کہ سلطانی گماشتوں کے پاس

ان کے لباس کے سوا کوئی زبانی یا تحریری پیغام نہیں ہوتا۔ ان کی آمد کا مقصد اُن کے مقررہ لباس سے معلوم ہوتا ہے۔ اس گماشتے کی آمد کا مقصد یہ بتانا ہوتا تھا کہ سلطان کو مجھ سے کوئی خدمت لینا ہے اور مجھے گھر پر رہ کر اس کے حکم کا انتظار کرنا ہے۔ یہ گماشتہ۔ یا اس لباس والا گماشتہ میرے یہاں پہلے بھی آ رہتا تھا۔ لیکن اس وقت اسے دیکھ کر مجھ کو تھوڑا تعجب ہوا۔ اس لیے کہ سلطان کی صحرائی مہم کو سر ہوئے زیادہ دن نہیں گزرے تھے اور بہ ظاہر ایک مدت تک اس بات کی توقع نہیں تھی کہ اُسے پھر کوئی ایسی مہم درپیش ہو جس کے لیے واقعہ نویس کی ضرورت پڑے۔ لیکن سلطان کا توقع کے خلاف کام کرنا کوئی ایسی بات نہیں تھی جس پر دیر تک تعجب کیا جاتا۔ اس لیے میرے نزدیک اس دن کی سب سے خاص بات یہ تھی کہ میرے لگائے ہوئے دو پودوں میں سے ایک سلطانی گماشتے کے پیروں کے نیچے آ کر کچل گیا تھا، لیکن دوسرا پودا محفوظ تھا اور اس کے بڑے ہو جانے کے بعد میں اس کے نیچے آرام کر سکتا تھا۔

(۲)

میں اُس کے نیچے آرام کر رہا تھا کہ مجھے ایک پرچھائیں حرکت کرتی نظر آئی اور سلطان کا ایک گماشتہ میرے سامنے آ کر کھڑا ہو گیا۔ گماشتوں کو پہچاننا مشکل نہیں ہوتا اگرچہ ان کے لباس مختلف ہوتے ہیں۔ میں نے کئی بار اوپر سے نیچے تک اس کے لباس کی ہر چیز کو، سلائی کے دھاگوں تک کو، غور سے دیکھا اور بار بار اپنے ذہن پر زور دیا۔ گماشتہ میرے اس معائنے کو خاموشی سے دیکھ رہا تھا اور اس کی آنکھوں میں دبی دبی حیرت نظر آ رہی تھی۔ آخر میں اس سے بات کرنے پر مجبور ہوا۔

"اب میری نگاہ ٹھیک کام نہیں کرتی،" میں نے اس سے کہا۔

"ظاہر ہے،" وہ میرے بالکل قریب آ کر بولا، "اس لیے کہ مجھے دیکھنے کے بعد بھی تم جہاں تھے وہیں ہو۔"

اور مجھے یاد آگیا۔

"طلبی"، میں نے کہا۔ "فوراً"

گماشتہ تیزی سے مڑ گیا۔ درخت کی ایک ابھری ہوئی جڑ سے اسے ٹھوکر لگی اور شاید چوٹ بھی آگئی۔ جب وہ واپس ہو رہا تھا تو اس کے پاؤں میں ہلکا سا لنگ تھا۔ شاید اسی لیے میں اس سے پہلے گھر سے باہر نکلا۔ کچھ دور چل کر میں رکا اور جب گماشتہ مجھ سے چند قدم آگے ہو گیا تو میں اس کے پیچھے پیچھے چلنے لگا۔

سلطان سے حکم لے کر واپس آتے ہوئے میں نے اپنی پرانی عادت کے مطابق بازاروں والا راستہ اختیار کیا۔ کئی چھوٹے بازاروں میں رک رک کر وہاں کی خرید و فروخت کو دیکھتا ہوا میں بڑے بازار میں داخل ہوا۔ بازار قریب قریب ویسا ہی تھا جیسا میں نے اسے آخری بار دیکھا تھا البتہ مجمع وہاں پہلے سے زیادہ نظر آ رہا تھا۔ بازار والوں کی مقررہ جگہوں میں بھی کوئی تبدیلی نہیں ہوئی تھی اس لیے میری نظر سب سے پہلے اُن باغبانوں پر پڑی جو زمین پر پھول پودے بچھائے بیٹھے تھے لیکن ان میں وہ بوڑھا باغبان دکھائی نہیں دے رہا تھا جس سے میں ہمیشہ، اور کبھی کبھی بلا ضرورت بھی، پودے خریدا کرتا تھا۔ دوسرے باغبانوں کے برخلاف وہ اپنے مال کو اس طرح ترتیب کے ساتھ سجا کر بیٹھتا تھا کہ اس کے سامنے ایک چھوٹا سا باغ لگا ہوا معلوم ہوتا تھا۔ بازار کے دوسرے باغبانوں کی طرح وہ بھی سلطانی باغوں میں کام کرتا تھا اور اُن فاضل پودوں کو بازار میں لے آتا تھا جو باغوں کی آرائشی ترتیب میں خلل پیدا کرنے کی وجہ سے اکھاڑ دیے جاتے تھے۔

بازار کے اس سرسبز حصے میں اس وقت میرے علاوہ صرف ایک گاہک اور تھا۔ باغبانوں نے ہمیں دیکھتے ہی پکار پکار کر مختلف پھولوں اور پودوں کے نام گنانا

شروع کر دیے۔ یہاں کا دستور تھا، لیکن وہ بوڑھا باغبان ان موقعوں پر خاموش رہتا تھا۔ اس وقت بھی میں نے دیکھا کہ ان بولتے ہوئے باغبانوں کے ہجوم میں ایک آدمی چپ بیٹھا ہے۔ میں اس کے سامنے جا کر رکا تو وہ خاموشی کے ساتھ اپنے سامنے لگے ہوئے پودوں کو اِدھر سے اُدھر کرنے لگا۔ میں نے زمین پر بیٹھ کر یوں ہی کچھ پودے اٹھا کے دیکھے، پھر پوچھا:

"یہاں ایک بوڑھا بیٹھا کرتا تھا، پودوں کو سجا کر۔"

اس نے اثبات میں سر ہلا دیا اور میں نے دیکھا کہ دوسرا گاہک بھی میرے قریب آکر بیٹھ گیا ہے اور ایک بڑے زرد پھول کی پنکھڑیوں کو چھیڑ رہا ہے۔ میں نے نوجوان باغبان کو ایک نظر دیکھ کر اس میں بوڑھے باغبان سے مشابہت تلاش کی۔

"وہ تمھارا کون تھا؟"

"دادا"، اس نے کہا۔

"تم بھی سلطانی باغ میں کام کرتے ہو؟"

اس نے پھر اثبات میں سر ہلا دیا۔

"اپنے دادا کی جگہ پر؟"

"باپ کی جگہ پر"، اس نے کہا۔

میں نے پورے بازار پر نظر دوڑائی اور پھر محسوس کیا کہ مجمع زیادہ ہو جانے کے سوا اس میں کوئی خاص تبدیلی نہیں ہوئی ہے، البتہ میرے داہنی جانب جس بڑے چبوترے پر تماشے دکھائے جاتے تھے وہ پہلے سے کچھ زیادہ اونچا معلوم ہو رہا تھا اور اس کے کنارے جگہ جگہ سے کٹ گئے تھے۔ چبوترے پر مجمع بازار کے دوسرے حصوں سے زیادہ تھا لیکن وہاں پہلے بھی مجمع زیادہ رہتا تھا۔ میں پھر باغبان کی طرف متوجہ ہو گیا،

"بڑے درختوں کے پودے نہیں ہیں؟"

اس نے کچھ پودے الگ کر کے میرے سامنے رکھ دیے۔ میں نے پودوں کو سرسری طور پر الٹ پلٹ کر دیکھا۔ دوسرا گاہک اب بھی زرد پھول کو چھیڑ رہا تھا اور اس کی دو پنکھڑیاں نیچے لٹک آئی تھیں، لیکن وہ پھول کے بجائے میری طرف دیکھ رہا تھا۔

"تم اسے خراب کر رہے ہو" میں نے اسے بتایا

"یہ میں نے لے لیا ہے"۔ اس نے باغبان کو بتایا اور پھول کے پودے کو کھینچ کر باہر نکال لیا۔

اس کے بعد بھی وہ وہیں بیٹھا رہا۔ مجھے خیال ہوا کہ کسی وجہ سے وہ میرے ساتھ ساتھ رہنا چاہتا ہے۔ میں نے ایک بار اس کو غور سے دیکھا لیکن اس کی صورت میری پہچانی ہوئی نہیں تھی۔ میں نے اپنی یادداشت پر زور دے کر اسے دیکھا لیکن اس میں مجھے اپنے کسی جاننے والے کی شباہت بھی محسوس نہیں ہوئی۔ پھر بھی وہ بار بار میری طرف دیکھ رہا تھا اس لیے مجھے الجھن سی ہوئی اور میں گھٹنوں پر ہاتھ رکھ کر اٹھنے لگا لیکن اسی وقت میری نظر باغبان کے پہلو میں سبز پودوں کے ایک چھوٹے سے ڈھیر پر پڑی۔ میں بیٹھ گیا۔ پھر اٹھا اور گھوم کر باغبان کے پہلو میں آیا۔ میں نے ایک پودے کو اٹھا کر دیکھا۔ پھر باغبان سے کہا:

"ان کی جڑیں نہیں ہیں۔"

"یہ لگانے کے لیے نہیں ہیں۔"

"پھر؟" دوسرے گاہک نے پوچھا

"لوگ لے جاتے ہیں"۔ باغبان نے کہا، "انھیں کھلانے کے لیے" اور اس نے تماشوں والے چبوترے کی طرف اشارہ کیا۔

دوسرا گاہک اب میرے پہلو میں کھڑا تھا۔ اس نے جھک کر ان میں سے دو تین

پودے اٹھائے اور باغبان سے پوچھا:

"اِن میں کیا خاص بات ہے؟"

"زہر۔"

اور میں سمجھ گیا کہ چبوترے پر کون لوگ تماشا دکھا رہے ہیں۔ میں نے باغبان سے، یا شاید اپنے آپ سے، پوچھا:

"یہ لوگ پھر آنے لگے ہیں؟"

"کیا یہ لوگ پہلے بھی آتے تھے؟" اُس نے مجھ سے پوچھا۔

وہ پہلے بھی آتے تھے۔ صحرا اُن کا مسکن تھا اور ہر سال تماشوں کے موسم میں ایک بار شہر کی طرف ان کا پھیرا ہوتا تھا۔ وہ دوپہر سے لے کر سورج ڈھلنے تک اپنا تماشا دکھاتے تھے، اور جب تک وہ چبوترے پر موجود رہتے دوسرے تماشاگروں کی طرف کوئی رُخ نہ کرتا تھا، اس لیے کبھی کبھی دوسروں سے اُن کا جھگڑا بھی ہو جاتا جسے تماشائی ختم کرا دیتے تھے۔

اور ان کا تماشا یہ تھا کہ وہ سب کچھ کھا لیتے تھے۔ تماشائی ان کے لیے ڈھونڈ ڈھونڈ کر ایسی چیزیں لاتے جنھیں ان کے خیال میں کوئی انسان بلکہ کوئی جانور بھی نہیں کھا سکتا تھا۔ لیکن یہ صحرا کے رہنے والے ہر چیز کھا لیتے اور اس کے بدلے میں تماشائیوں سے انعام پاتے تھے۔ لوگ ان کا تماشا دیکھ کر کبھی ہنستے ہنستے زمین پر بیٹھ جاتے، کبھی خوف زدہ ہو کر پیچھے ہٹنے لگتے اور کبھی کراہت سے منھ پھیر لیتے۔ اس تماشے سے کسی کسی تماشائی کی طبیعت بگڑ جاتی اور اس کے ساتھی اسے الگ ہٹا لے جاتے، لیکن چبوترے پر لگا ہوا مجمع دوپہر سے لے کر سورج ڈھلنے تک کسی بھی وقت کم نہ ہوتا تھا۔

سلطان کی صحرائی مہم شروع ہونے سے کئی موسم پہلے ہی ان لوگوں نے شہر میں آنا

چھوڑ دیا تھا۔ صحرائی مُہم ختم ہونے کے بعد بھی یہ لوگ نہیں آئے۔ مجھے یقین تھا کہ شہر میں اب ان کا تماشا کبھی دیکھنے میں نہیں آئے گا لیکن اس وقت وہ تماشا دکھا رہے تھے اور بڑے بازار کے چبوترے پر مجمع ہمیشہ سے زیادہ تھا۔ اس مجمعے میں سے دو تین تماشائی چبوترے پر سے نیچے کودے اور آپس میں ہنسی مذاق کرتے ہوئے ہماری طرف آئے۔

"لاؤ"، ان میں سے ایک نے ہاتھ بڑھا کر باغبان سے کہا۔

دوسرے گاہک نے اپنے ہاتھ کے پودے زمین پر ڈال دیے اور تماشائیوں نے دوسرے پودوں کے ساتھ انھیں بھی سمیٹ لیا۔

تماشائیوں کے واپس جانے کے بعد میں مڑا۔ مجھے باغبان کی آواز سُنائی دی۔

"ان کے زہر کا کوئی توڑ نہیں ہے"، وہ کہہ رہا تھا، "انھیں شہر کے اندر نہیں لگایا جاتا۔"

میں تماشوں والے چبوترے کی طرف بڑھ گیا۔

(۳)

سورج ڈھلنے میں ابھی دیر تھی۔ چبوترے کے قریب پہنچ کر میں رُکا۔ دوسرا گاہک میرے برابر سے ہوتا ہوا چبوترے پر چڑھ گیا۔ میں نے اسے تماشائیوں کی بھیڑ میں گم ہوتے دیکھا۔ لیکن جب میں بازار سے آگے بڑھ کر صحرا کے راستے پر مڑا تو وہ کچھ فاصلے پر میرے پیچھے پیچھے چل رہا تھا۔ میں خاموشی کے ساتھ آگے بڑھتا رہا یہاں تک کہ شہر کی حد ختم کے قریب پہنچی اور دور پر صحرا کا حاشیہ نظر آنے لگا۔ میں رکا اور سستانے کے لیے ایک پتھر پر بیٹھ گیا۔ کچھ دیر بعد وہ میرے سامنے کھڑا تھا۔ میں نے سر اٹھا کر اسے دیکھا۔ وہ بھی خاموشی سے مجھے دیکھ رہا تھا۔ آخر میں نے اُس

سے پوچھا:

"کیا مجھے پہچانتے ہو؟"

اس نے میرے قریب کے پتھر پر بیٹھ کر انگڑائی سی لی۔

"پہچانتے ہو؟" میں نے پھر پوچھا۔

"سلطان مظفر کا واقعہ نویس"، اس نے اعلان کرنے کے سے انداز میں کہا، "اس مقبرے کے بننے کا حال لکھنے جا رہا ہے جسے اُس نے بنتے نہیں دیکھا۔"

اس کے بعد وہ یوں چپ ہو گیا جیسے اُس نے کچھ کہا ہی نہ ہو۔

سلطان کا کارندہ، میں نے سوچا اور اس سے پوچھا:

"کیا تم مجھے اذیّت دینے کے لیے مقرّر ہوئے ہو؟"

لیکن وہ خود کسی اذیّت میں مبتلا معلوم ہوتا تھا۔ مجھے اُس کے ساتھ مبہم سی ہمدردی محسوس ہوئی۔

"میں تمھیں مقبرے کو دیکھتے ہوئے دیکھنے پر مامور ہوا ہوں،" اس نے کہا۔

"صرف دیکھنے پر؟"

"اور اس پر کہ جب تم اس کی تعمیر کا واقعہ لکھ لو تو میں اس کی تاریخ لکھوں۔"

مجھے حیرت ہوئی، اس لیے کہ اس کی عمر زیادہ نہیں معلوم ہوتی تھی۔

"سلطانی مورّخ؟" میں نے پوچھا، "اور وہ جو تم سے پہلے تھا؟"

"مجھ سے پہلے کئی تھے۔"

"وہ جو صحرائی مہم کے زمانے میں تھا۔"

"اُسے مرنا پڑا۔"

اسی وقت صحرا کی طرف سے آتے ہوئے لوگوں کا ایک جتھا ہمارے قریب سے گزرا۔ یہ دوسرے شہروں کے رہنے والے معلوم ہوتے تھے۔ پھر کچھ اور جتھے گزرے۔

صحرا کی طرف جاتا ہوا مجھے کوئی نظر نہیں آیا۔ کچھ دیر تک ہمارے آس پاس سناٹا رہا، پھر راستوں پر عارضی دکانیں لگانے والے اپنے اپنے مال کے ساتھ تیز قدموں سے ہماری طرف آتے دکھائی دیے۔ ہمارے قریب پہنچ کر ان میں سے ایک دو ذرا سا رُکے، لیکن ہمارا دھیان کسی بھی طرف نہ دیکھ کر آگے بڑھ گئے۔ پھر مجھے اپنی جگہ بیٹھے بیٹھے محسوس ہونے لگا کہ اب صحرا میں سناٹا ہے۔ اسی وقت میرا ساتھی اٹھ کھڑا ہوا۔

"وقت ہو گیا"، اس نے کہا اور صحرا کی طرف چل دیا۔

میں نے سورج کو ڈھلتے ہوئے دیکھا اور اٹھ کر اس کے برابر چلنے لگا۔ ہم خاموشی کے ساتھ راستہ طے کرتے ہوئے صحرا کے حاشیے تک آ گئے۔ مجھے دور پر ایک عمارت کا ہیولا نظر آیا۔ اس تک پہنچنے کے لیے ایک لمبی سیدھی سڑک بنا دی گئی تھی۔ سڑک پر پتھر کی چھوٹی چھوٹی سلوں کا فرش تھا جس کے دونوں کناروں پر پتھر ہی کی نیچی نیچی سی خانوں دار دیواریں اٹھائی گئی تھیں۔ سڑک دونوں کناروں پر اتنی ڈھلوان تھی کہ اس پر جمع ہونے والی ریت دیواروں کے نچلے خانوں سے مسلسل باہر گر رہی تھی جیسے شہر کی برسات میں نالیوں سے پانی نکلتا ہے۔ ہم اس سڑک کو بھی خاموشی کے ساتھ طے کرتے رہے۔ مقبرہ اب نظر نہیں آ رہا تھا اور سڑک رفتہ رفتہ بلند ہوتی جا رہی تھی یہاں تک کہ اس کا خاتمہ ایک اونچے چبوترے کی سیڑھیوں پر ہوا۔ ہم سیڑھیاں چڑھ کر چبوترے پر پہنچے۔ چبوترے کے دوسری جانب ویسی ہی ایک سڑک نشیب کی طرف جا رہی تھی۔ اس سیدھی سڑک پر بہت آگے جہاں اس کی دونوں دیواریں قریب قریب ملی ہوئی نظر آ رہی تھیں، مقبرہ اس کے راستے میں حائل تھا اور ایسا معلوم ہوتا تھا کہ سڑک ایک نوک کی طرح اسے چیرتی ہوئی دوسری طرف صحرا کے قلب تک پہنچ گئی ہے۔

میں پھر تھک گیا تھا۔ صحرا کی ہوا کے گرم تھپیڑے میری تھکن کو بڑھا رہے تھے

لیکن ان میں قریب آتی ہوئی شام کی خنکی بھی شامل ہونے لگی تھی اس لیے میں نے کچھ دیر چبوترے پر سستانے کا فیصلہ کیا۔ چبوترے کا سفید سنگی فرش گرم تھا، پھر بھی میں اس پر بیٹھ سکتا تھا۔ میں بیٹھ گیا۔ اتنے فاصلے سے مقبرے کی عمارت میں مجھے کوئی انوکھا پن محسوس نہیں ہوا۔ اس کی گنبد دار مدور چھت پر ڈھلتے ہوئے سورج کی روشنی پڑ رہی تھی۔ میں نے کہا:

"اس کی چھت..."

"نہیں ہے"، میرا ساتھی بولا، "صرف دور سے نظر آتی ہے۔"

"قریب چل کر دیکھیں۔"

"نہیں"، وہ بولا، "جب تک نگراں نہ آجائے۔"

نگراں کے انتظار میں مجھ کو سنگی فرش پر کچھ دیر اور بیٹھنا پڑا۔ میرا خیال تھا کہ وہ اسی سڑک سے آئے گا جس سے ہم آئے تھے۔ لیکن وہ مقبرے کے پیچھے سے گھوم کر آتا دکھائی دیا۔ تیزی سے چلتا ہوا وہ چبوترے پر چڑھا، رسمی انداز میں ہمارے سامنے جھکا اور آہستہ سے پیچھے مڑ کر ہمارے آگے آگے چلنے لگا۔ چبوترے سے مقبرے کا فاصلہ میرے اندازے سے کم تھا۔ تھوڑی ہی دیر میں ہم اس کے پھاٹک کے سامنے کھڑے تھے۔ یہاں پہنچ کر نگراں نے بولنا شروع کیا۔ زمین کی پیمائش سے لے کر پتھر کی آخری سل کے رکھے جانے تک کا حال اس نے اس طرح بیان کیا جیسے مجھ کو مقبرہ بنتے دکھا رہا ہو۔ کہیں کہیں تو مجھے ایسا محسوس ہونے لگا کہ میں اس کا کہا ہوا سن نہیں رہا ہوں بلکہ اپنا لکھا ہوا پڑھ رہا ہوں۔

بیان ختم کرنے کے بعد نگراں چبوترے کی سمت بڑھا تھا کہ میں نے اس کے سینے پر ہاتھ رکھ دیا۔

"تم نے سب کچھ بتا دیا ہے"، میں نے کہا، "لیکن میں اسے دیکھنا بھی چاہتا

ہوں۔"

پھر میں پھاٹک کے اندر داخل ہو گیا۔ مجھے ہر طرف دیواریں ہی دیواریں نظر آئیں۔ آگے پیچھے بنی ہوئی اونچی نیچی دیواریں مختلف زاویوں سے ایک دوسرے کے قریب آتیں، پھر دور ہو جاتیں۔ سب سے اونچی دیواریں سب سے پیچھے تھیں۔ یہ نیم دائرے کی شکل میں اٹھائی گئی تھیں اور یہی دور سے چھت کا فریب دیتی تھیں۔ دیواروں کی کثرت سے، اور کچھ اس وجہ سے کہ سورج نیچا ہو چکا تھا، مقبرے کے اندر اندھیرا اندھیرا سا تھا اور اس پر چھت کا نہ ہونا محسوس نہیں ہوتا تھا۔ دیواروں نے اِدھر اُدھر گھومتی ہوئی راہ داریوں کی بھول بھلیّاں سی بنا دی تھی جس کے وسط کا پتا لگانا ممکن نہ تھا۔ اور جب میں نے باہر نکلنا چاہا تو مجھے راستہ نہیں ملا۔ شاید اسی لیے لوگ دور دور سے مقبرے کو دیکھنے آتے تھے۔ میں دیر تک ان راہ داریوں میں بھٹکتا پھرا یہاں تک کہ نگراں مجھے ڈھونڈھتا ہوا آ پہنچا۔

کچھ دیر بعد ہم پھر اسی چبوترے پر تھے۔ میں نے نگراں سے کہا۔

"مجھے کچھ اور بھی معلوم کرنا ہے۔"

وہ کچھ پریشان سا نظر آنے لگا۔

"میں نے شروع سے آخر تک سب بتا دیا ہے۔" وہ آہستہ سے بولا۔

"تم نے اسے شروع سے آخر تک بنتے دیکھا ہے؟"

وہ چپ رہا۔

"اسے بنانے میں صرف شہر کے لوگوں سے کام لیا گیا تھا؟" میں نے پوچھا۔

"بعد میں صحرا والوں سے بھی۔"

"ان کا نگراں کون تھا؟"

"میں تھا۔"

"کیا انھیں معلوم تھا کہ وہ مقبرہ بنا رہے ہیں؟"

"وہ معلوم تھا۔ انھیں پہلے ہی بتا دیا گیا تھا۔"

"کہ وہ سلطان کا مقبرہ بنا رہے ہیں؟"

وہ پھر چپ رہا اور پہلے سے زیادہ پریشان نظر آنے لگا۔

"مقبرے کے لیے جگہ کس نے مقرر کی تھی؟"

"سلطان نے۔"

"پتھر کہاں سے آیا؟"

"بتا چکا ہوں۔ مقبروں والی وادی کے پار پہاڑوں کا جو سلسلہ ہے۔۔۔"

"۔۔۔ وہاں سے لایا گیا تھا، مگر کس عمارت کے لیے؟"

"وہ مقبرے میں لگایا گیا ہے۔"

"مقبرہ ٹھیک اس جگہ پر ہے جہاں صحرائی مہم والا قلعہ تھا۔ قلعے میں کون سا پتھر استعمال ہوا تھا؟"

اس نے قدرے حیرت سے میری طرف دیکھا اور بولا:

"مجھے مقبرے کا حال بتانے کا حکم ہوا ہے، قلعہ میں نے نہیں دیکھا۔"

"اسے گرا دیا گیا تھا،" میں نے اس کو بتایا۔

نگراں خاموش کھڑا رہا۔ میں نے مقبرے کی طرف جاتی ہوئی سڑک کو دیکھا، پھر صحرا میں آتی ہوئی سڑک کو۔ دونوں سڑکیں ایک سی تھیں، بلکہ اگر چبوترہ نہ ہوتا تو وہ ایک ہی سڑک تھی۔

"یہ چبوترہ۔۔۔" میں نے چبوترے کے خوبصورت ترشے ہوئے سفید پتھروں پر جھک کر پوچھا، "۔۔۔ یہ چبوترہ کیوں بنایا گیا ہے؟"

"آرام کرنے کے لیے،" اس نے جواب دیا۔

"اس کے اوپر؟"

"ظاہر ہے۔"

"اس کے نیچے کیا ہے؟"

"ریت۔"

"اس کی جگہ بھی سلطان نے مقرر کی تھی؟"

"نہیں، سلطانی کارندوں میں سے کسی نے"، وہ بولا، "مگر سلطان ہی کے حکم سے۔"

"ظاہر ہے"، میں نے بھی کہا۔

وہ بار بار سورج کی طرف دیکھ رہا تھا اس لیے میں نے اس سے آخری سوال کیا:

"مجھے یہ بتا نا کیوں ضروری نہیں تھا کہ مقبرے میں قلعے کا پتھر استعمال ہوا ہے؟"

"میں نے وہ سب بتا دیا ہے جو بتانے کا مجھے حکم تھا"، اس نے کہا اور مجھے اس کے لہجے میں جھلاہٹ کے ساتھ ہلکے سے خوف کی آمیزش محسوس ہوئی۔ "اس کے سوا تم جو کچھ لکھو گے وہ میرا بتایا ہوا نہیں ہوگا"، پھر وہ میرے ساتھی کی طرف مڑا اور بولا، "اور اس کی گواہی تمھیں دینا ہوگی۔"

وہ چبوترے سے شہر کی طرف والی سڑک پر اترا اور اس کے بائیں پہلو کی دیوار پر ہاتھ ٹیکتا ہوا آگے بڑھتا گیا۔ سڑک کے ڈھلواں کنارے پر جمع ہونے والی ریت اس کے پیروں سے منتشر ہو کر دیوار کے نچلے خانوں سے اور بھی تیزی کے ساتھ باہر گرنے لگی اور ڈوبتے ہوئے سورج کی روشنی میں اس کے بہت سے ذرے مجھے چنگاریوں کی طرح چمکتے نظر آئے۔

نگراں کے آخری جملے نے مجھے اپنے ساتھی کا وجود یاد دلا دیا تھا۔ میں نے

اس کی طرف دیکھا۔ اس کی عمر واقعی کم تھی۔ میں نے اس سے پوچھا:

"تمھیں تاریخ لکھنا کس نے سکھایا؟"

"کسی نے نہیں"، وہ بولا، "میں نے صرف پڑھا ہے۔"

"کتنا پڑھا ہے؟"

اس نے کئی علموں کے نام گنا دیے۔

"اور تاریخ؟"

"صرف ایک۔ صحرائی مہم کی تاریخ۔"

مجھ کو صحرائی مہم کے زمانے والا مورّخ یاد آیا۔ وہ میرا داحد دشمن تھا۔ مجھے اس کی آواز یاد آئی اور یہ بھی کہ جب وہ ہنستا تھا تو اس کی آنکھیں اپنے آپ بند ہو جاتی تھیں۔

"تم نے کہا تھا اسے مرنا پڑا؟" میں نے پوچھا۔

"ہاں، صحرائی مہم کی تاریخ سلطان کو پسند نہیں آئی تھی۔"

"لیکن وہ بہت اچھا مورّخ تھا۔"

"اس نے تاریخ میں وہ سب لکھ دیا تھا جو صحرائی مہم کے واقعہ نویس نے لکھا تھا"، وہ بولا، کچھ رکا۔ پھر بولا، "یہ بات اس نے اپنی صفائی میں بھی کہی تھی۔"

"صفائی میں؟" میں نے پوچھا، "اور اس پر الزام کیا تھا؟"

"یہی۔ اس نے تاریخ میں وہ سب لکھ دیا تھا جو واقعہ نویس نے لکھا تھا۔"

"اسے کس طرح مرنا پڑا؟"

"کسی درخت کے زہریلے پھل کھا کر۔"

"سلطان کے حکم سے؟"

اس نے کوئی جواب نہیں دیا۔ میں نے پھر پوچھا:

"سلطان کے حکم سے؟"

"سلطان کے حکم سے وہ تاریخ اب میں لکھ رہا ہوں۔"

"وہ اب تمھارے پاس ہے؟"

اس نے اثبات میں سر ہلا دیا۔

"اور واقعہ نویس کا بیان بھی؟"

"واقعہ نویس کا بیان بھی۔"

"اُسے ضائع نہیں کیا گیا۔"

"کیا جائے گا، جب میں تاریخ لکھ کر سلطان کو پیش کر دوں گا، مجھے یقین دلایا گیا ہے۔"

"کہاں تک لکھ چکے ہو؟"

"صحرا میں سلطان کا پہنچنا۔۔"

"۔۔۔ اور قلعے میں۔۔۔"

"وہاں کوئی قلعہ نہیں تھا۔"

میں نے حیرت سے اس کی طرف دیکھا اور اس نے ایک ایک لفظ پر زور دے کر کہا:

"کوئی قلعہ نہیں تھا، اور قلعے میں کوئی عورت نہیں تھی۔"

میں نے اور زیادہ حیرت سے اس کی طرف دیکھا۔

"تم نے لکھا ہے"، وہ تیز آواز میں بولا، "میں نہیں لکھوں گا۔ مجھے اس کا حق دیا گیا ہے۔"

"اس لیے یہ تمھارا فرض بھی ہے۔" میں نے دھیمی آواز میں کہا۔

"مگر ہم اس کی، مہم کی بات کیوں کر رہے ہیں" اس نے کہا، پھر مجھے

چبوترہ کے سنگی فرش پر بیٹھتے ہوئے کر میری طرف بڑھا اور بولا، "کچھ دیر میں یہاں اندھیرا ہو جائے گا۔"

"میں ابھی یہیں رہوں گا"، میں نے کہا۔ "شاید یہاں مجھے صبح ہو جائے۔"

"آج ہی سے لکھنا شروع کر دو گے؟"

"نہیں، کاغذ مجھے کل ملیں گے۔" میں نے کہا، پھر اُسے بتایا۔ "واقعہ نویسی سلطانی کاغذوں پر ہوتی ہے۔ کاغذ تمھیں بھی ملیں گے لیکن ان پر سلطان کی مہر نہیں ہو گی اور وہ گن کر نہیں دیے جائیں گے۔"

اُسے یہ بتاتے وقت مجھے خیال نہیں رہا کہ اس کے پاس ایک واقعہ نویس کا بیان موجود ہے اور خود وہ تاریخ لکھنا شروع کر چکا ہے۔ اس نے میری بات کو بے توجہی سے سُنا، البتہ ابھی تک وہ مجھ سے خفا خفا سا تھا لیکن اب اس نے میرے برابر زمین پر بیٹھ کر میرے کندھے پر ہاتھ رکھا اور رازدارانہ لہجے میں بولا:

"اس مقبرے کا بننا... کیا ایسا نہیں ہو سکتا کہ ہم دونوں اس کے بننے کا حال ساتھ ساتھ لکھیں؟"

"پھر تمھیں بھی اپنی صفائی میں کہنا پڑے گا کہ تم نے وہی سب لکھ دیا ہے جو مقبرے کی تعمیر کے واقعہ نویس نے لکھا تھا۔"

وہ کچھ دیر گم سم بیٹھا رہا۔ پھر میرے کندھے پر زور دے کر اٹھ کھڑا ہوا اور بولا:

"مجھے دیر ہو رہی ہے۔"

"تمھارا کام میرے بعد شروع ہو گا"، میں نے کہا۔ "ابھی آرام کرو۔"

"اور تم یہیں رہو گے؟" اس نے قدرے تشویش کے ساتھ کہا، "یہاں رات کو ٹھنڈک زیادہ ہو جاتی ہے۔"

"میں برداشت کر لوں گا"، میں نے کہا، "نہیں تو مقبرے کے اندر پناہ لوں گا۔"

اس وقت نہ مجھے خیال آیا، اور نہ شاید اسے، کہ مقبرے میں صرف دیواریں ہیں۔

اُس کے جاتے ہی صحرا میں اندھیرا پھیلنا شروع ہوا اور میرے سامنے مقبرے کی عمارت دُھندلا گئی۔ میں کئی بار پہلو بدل کر ذرا آرام سے بیٹھ گیا۔ اب صرف اتنا معلوم ہوتا تھا کہ سامنے کوئی عمارت ہے اور اس عمارت کی وجہ سے مجھ کو یہ احساس نہیں ہو رہا تھا کہ میں صحرا میں ہوں۔ کچھ دیر بعد یہ عمارت ایک بہت بڑے دھبے کی طرح رہ گئی اور دیکھنے والے کا تصوّر اسے کوئی بھی شکل دے سکتا تھا۔ میرے تصوّر نے اسے قلعے کی شکل دی اور دیکھتے دیکھتے مجھے اس کا برج اور فصیل نظر آنے لگی۔ شہر کی جھیلوں پر سے واپس ہوتے ہوئے صحرائی پرندوں کے پروں کی سنسناہٹ میرے قریب سے ہوتی ہوئی دور نکل گئی اور مجھے سلطان کی صحرائی مہم یاد آنے لگی۔ میں نے اسے بھلانا چاہا، لیکن یہ بے سود تھا۔

(۴)

مجھے قلعے کے مشرقی بُرج میں بٹھایا گیا تھا۔ گنے ہوئے سلطانی کاغذوں کا پلندہ میرے سامنے تھا۔ سفید پتھر کا ایک خوبصورت مہرہ اُسے دبائے ہوئے تھا تاکہ ہوا، جو برجوں پر ہمیشہ تیز رہتی ہے، کاغذوں کو اڑا نہ لے جائے۔ ہر کاغذ کی پیشانی پر سلطان کی سنہری مُہر۔۔ ایک تاج، دو تلواریں اور اُن پر سایہ کیے ہوئے ایک چھتری۔ نکلتے ہوئے سورج کی روشنی میں چمک رہی تھی۔ مجھے بُرج میں اس وقت بٹھا دیا گیا تھا جب سورج نکلنے میں دیر تھی، اس لیے میں اُن لوگوں کو دیکھ نہیں سکا جو مجھے برج تک لا کر خاموشی سے نیچے اتر گئے تھے۔ میں سفید مہرے پر ایک ہاتھ رکھے سورج نکلنے کا

انتظار کر رہا تھا تاکہ اس کی روشنی کو ہر طرف پھیلی ہوئی ریت کی لہروں پر دوڑتے دیکھوں، اور اس کے بعد میری آنکھیں جو کچھ دیکھیں میرا قلم اس کو کاغذ پر لے آئے۔ یہ میرے لیے آسان تھا اس لیے کہ میں جو کچھ دیکھتا اور لکھتا تھا اس کو سمجھنے سمجھانے کی ذمہ داری مجھ پر نہیں ہوتی تھی۔ اور صحرائی مہم کے بارے میں تو مجھے کچھ بتایا بھی نہیں گیا تھا۔ میں شہر کے بازاروں میں صرف یہ سنتا تھا کہ مہم شروع ہو چکی ہے اور سلطان خود بھی صحرا میں ہے۔ پھر آدھی رات کے وقت میری فوراً طلبی ہوئی اور اندھیرے ہی میں مجھے سلطانی کاغذوں کے پلندے کے ساتھ مشرقی برج میں بٹھا دیا گیا۔ اس وقت مجھے یہ بھی پتا نہیں تھا کہ میں کسی قلعے کے برج میں ہوں یا میرے بیٹھنے کے لیے بلندی پر کوئی عارضی چوکی بنائی گئی ہے تاکہ صحرا میں دور دور تک جو کچھ ہو وہ مجھے صاف دکھائی دے۔ اس لیے میرا دماغ بالکل خالی تھا اور میں روشنی کا انتظار کر رہا تھا۔

لیکن جب روشنی پھیلی تو مجھے اپنے سامنے قلعے کی فصیل نظر آئی۔ اس کے پیچھے خاموش آسمان کے سوا کچھ نہ تھا۔ میرے برج اور فصیل کے درمیان ایک چھت تھی اور اس چھت پر میں نے سلطان کو کپڑوں کے ایک ڈھیر پر جھکے ہوئے دیکھا۔ وہ اسی طرح جھکا رہا یہاں تک کہ سورج کی پہلی کرنیں آ پہنچیں۔ تب وہ اٹھا اور آہستہ آہستہ چلتا ہوا فصیل تک گیا۔ فصیل اس کے قد سے کچھ کم تھی۔ اس نے پنجوں پر کھڑے ہو کر فصیل کے باہر جھانکا، پھر وہ چھت کی طرف مڑ کر کھڑا ہو گیا۔ کمر سے اوپر وہ پورا جنگی لباس پہنے ہوئے تھا جس کے فولادی حصوں پر سورج کی کرنیں پڑنے سے ستارے سے چمکتے تھے۔

"ہر طرف صحرا ہی صحرا ہے"۔ اس نے کہا۔ اس کی بھاری بلند آواز یہاں کھلی فضا میں کچھ کھوکھلی سی معلوم ہوئی اور مجھ کو بمشکل سنائی دی۔

"صحرا ہی صحرا"، اس نے پھر کہا اور مجھے گمان ہوا کہ وہ مجھ سے مخاطب ہے۔

لیکن اسی وقت مجھے چھت پر کپڑوں کے ڈھیر میں حرکت نظر آئی اور میں نے وہاں پر ایک عورت کو کھڑے ہوتے دیکھا۔ اس کا چہرہ اُس کے بالوں سے چھپا ہوا تھا اس لیے میں اس کی صورت نہیں دیکھ سکا لیکن جب وہ سلطان کی طرف بڑھی تو اس کی چال سے مجھے اندازہ ہوا کہ وہ شہر کی عورت نہیں ہے۔ تہہ در تہہ لباس نے اس کے بدن کے زیادہ حصّے کو ڈھانپ رکھا تھا پھر بھی مجھ کو اس کی گردن اور ہاتھوں کے کچھ زیوروں کی چمک نظر آئی۔

"میں دیکھوں"، اس نے سلطان کے قریب پہنچ کر کہا اور دونوں ہاتھ فصیل کے اوپر رکھ کر اس طرح زور لگایا جیسے وہ فصیل کے اوپر جانا نہیں بلکہ فصیل کو اپنی طرف کھینچنا چاہتی ہو۔

سلطان کچھ دیر تک اس کی کوشش کو دیکھتا رہا۔ پھر اس نے عورت کے دونوں شانے پکڑ کر اسے اوپر اٹھایا اور عورت کے چیخنے کی آواز ایک طرف میرے برج سے ٹکرائی اور دوسری طرف دور کہیں صحرا سے آتی سنائی دی۔ سلطان نے اُسے زمین پر ٹکا دیا۔ عورت کے بال اس کے جنگی لباس کے بعض نوکیلے حصّوں میں اُلجھ گئے تھے اور وہ تکلیف میں تھی۔ سلطان نے مشکل سے اور آہستہ آہستہ اس کے بال چھڑائے اور اس کے شانے پھر پکڑ لیے۔

"دیکھو"، اس نے عورت کو اوپر اٹھانے کی کوشش کرتے ہوئے کہا لیکن وہ تڑپ کر اس کی گرفت سے نکل گئی۔

"مجھے نہیں دیکھنا"، وہ نفرت سے بولی اور چھت پر کپڑوں کے پاس آ کر بیٹھ گئی۔

کچھ دیر بعد سلطان بھی آ کر اس کے قریب بیٹھ گیا اور دیر تک بیٹھا رہا۔

اس اجنبی منظر کو دیکھ کر مجھے یہ بھی یاد نہیں رہا کہ میں برج میں واقعہ نویسی کیلئے بیٹھا ہوں، اس لیے میں چپ چاپ سامنے دیکھتا رہا یہاں تک کہ دھوپ تیز ہوئی اور

سلطان کا چہرہ کچھ اور سُرخ ہو گیا۔

"دھوپ پھر بڑھ رہی ہے"، اس نے عورت سے کہا، برج کے پہلو کی طرف اشارہ کیا اور اب شاہانہ لہجے میں بولا، "اُدھر چلو، چھت کے نیچے۔"

"چھت کے نیچے نہیں"، عورت نے سپاٹ لہجے میں جواب دیا، "وہاں میں مر جاؤں گی۔"

اور ایسا معلوم ہوتا تھا کہ سلطان یہ جواب کئی مرتبہ سن چکا ہے، اس لیے کہ وہ کچھ کہے بغیر اٹھا، فصیل تک گیا اور باہر جھانک کر پھر عورت کے پاس آگیا۔

"مجھے واپس جانا ہوگا"، اس نے کہا، "اور تمھیں میرے ساتھ چلنا ہوگا۔"

"شہر میں نہیں"، عورت نے پھر اسی لہجے میں جواب دیا، "وہاں چھتیں ہوں گی۔"

دھوپ اور بڑھی اور برج پر کی تیز ہوا میں گرمی آگئی۔ سلطان نے پھر جا کر فصیل سے باہر جھانکا اور برج کے دوسرے پہلو کی طرف آ کر کسی کو آواز دی۔

"اب کیا ہو رہا ہے؟" اس نے پوچھا، "باہر کچھ ٹھیک دکھائی نہیں دیتا۔"

جواب میں کسی سلطانی کارندے کی آواز سنائی دی جس میں ہلکی سی گونج تھی لیکن میری سمجھ میں نہیں آیا کہ اس نے کیا کہا، البتہ اس آواز نے مجھے یاد دلا دیا کہ میں سلطان کی صحرائی مہم کا واقعہ نویس ہوں۔

"انھیں گھیر اپنا لینے دو"، سلطان نے کہا۔

کارندے نے کچھ اور کہا۔ سلطان بولا:

"نہیں، وہ ساتھ جائے گی۔"

کارندے کے کسی اور سوال کے جواب میں اُس نے کہا:

"یادگار بھی"، اس نے مڑ کر عورت کی طرف دیکھا، "اور ثبوت بھی۔"

اس کے بعد اس کی توجہ عورت کی طرف سے قریب قریب ہٹ گئی اور وہ زیادہ تر

اسی کارندے سے سوال جواب کرتا رہا۔ کارندے کی بات مجھے کبھی سنائی دیتی، کبھی سنائی دیتی، کبھی سمجھ میں آتی کبھی نہ آتی، پھر بھی اس طرح مجھ کو صحرائی مہم کی کچھ ایسی تفصیلیں معلوم ہوگئیں جن کی واقعہ نویسی میں آنکھوں دیکھے منظروں کی طرح کرسکتا تھا۔ میں نے اپنے ذہن میں ان منظروں کو ترتیب دینا بھی شروع کر دیا تھا کہ مجھے پروں کی سنسناہٹ سنائی دی اور چھت پر سائے سے گزرتے نظر آئے۔ ان سایوں کے ساتھ لمبی لمبی لکیریں جڑی ہوئی تھیں۔ سائے فصیل سے آگے نکل گئے تو میں نے دیکھا کہ یہ صحرائی پرندوں کی چھوٹی چھوٹی ٹکڑیاں تھیں، اور ان ٹکڑیوں کا ہر پرندہ تیر سے چھدا ہوا تھا۔ سلطان نے اُن کی اُڑان کو حیرت سے دیکھا۔ مجھے بھی حیرت ہوئی۔ اس لیے کہ یہ پرندے اپنے لمبے پروں کو پورا پھیلائے ہوئے اطمینان کے ساتھ ہوا میں تیر رہے تھے۔ سلطان نے بظاہر اپنے آپ سے کہا:

"ایسا معلوم ہوتا ہے یہ تیروں کی قوت سے اڑ رہے ہیں۔"

لیکن میں دیکھ رہا تھا کہ فصیل سے آگے نکل جانے کے بعد یہ پرندے پر پھڑپھڑاتے اور ہوا میں لوٹتے ہوئے نیچے گر جاتے۔ کوئی کوئی پرندہ اتنی تیزی سے لوٹتا کہ اس کے بدن میں چبھے ہوئے تیر سے آسمان میں دائرہ سا بن جاتا تھا۔ یہ منظر میں سلطان کی شکارگاہوں میں بھی بارہا دیکھ چکا تھا۔

کئی اور ٹکڑیاں چھت کے اوپر سے گزریں۔ سلطان فصیل سے پیٹھ لگائے انہیں غور سے دیکھ رہا تھا، جیسے پرندوں کا شمار کر رہا ہو۔ اچانک اس نے کمر سے خنجر کھینچ لیا اور کئی قدم آگے بڑھ آیا۔

"ان میں ایک بہت نیچے آ رہا ہے"، اُس نے وہیں سے اپنے کارندے کو بتایا۔ "اور اس کے تیر نہیں لگا ہے۔"

اُسی وقت میں نے دیکھا کہ عورت لپکتی ہوئی سلطان کے قریب آئی۔ سلطان

نے اسے کھینچ کر اپنے پیچھے کر لیا اور خود بھی پیچھے کی طرف خم ہو کر خنجر تانا۔ پروں کی پھڑپھڑاہٹ سنائی دی، ایک پرندہ سلطان اور عورت پر جھکا، مجھے یقین تھا کہ وہ فصیل سے ٹکرا کر وہیں پر گر جائے گا لیکن اس نے پروں کو زور سے پھڑپھڑایا اور اوپر اٹھا۔ فصیل سے آگے نکل کر اس نے اپنے پر پورے پھیلا دیے اور ہوا میں تیرتا ہوا غائب ہو گیا۔ یہ سب ایک ساتھ ہوا اور اسی کے ساتھ میں نے عورت کی چیخ سنی۔ سلطان کا خنجر اس کے بالوں میں پھنس گیا تھا اور وہ پھر تکلیف میں تھی۔ سلطان نے جھٹکے دے دے کر اپنے خنجر کو آزاد کیا۔ اس میں بالوں کے کئی لچھے کٹ کر فرش پر گرے اور شاید پتھر کی حدت سے کچھ دیر تک وہیں پڑے بل کھاتے رہے۔

سلطان خنجر تانے ہوئے اس پرندے کو آسمان میں تلاش کر رہا تھا کہ فصیل سے بہت دور پر ریت کا ایک بادل سا اٹھا اور آہستہ آہستہ سرکتا ہوا فصیل کے قریب آنے لگا۔ اور اس بار کارندے کی آواز میں نے بالکل صاف سنی۔

"کچھ ہونے والا ہے"، وہ کہہ رہا تھا، "اب کھلی جگہ پر ٹھہرنا ٹھیک نہیں۔"

"میں ابھی یہیں رہوں گا"، سلطان نے جواب دیا، "انھیں گھیرا بنا لینے دو۔"

"کم سے کم وہ اندر بھیج دی جائے۔"

"وہ بھی یہیں رہے گی۔"

"شاید وہ اسے مار دینا چاہیں۔"

"نہیں چاہیں گے"، سلطان نے بڑے اعتماد کے ساتھ کہا۔

جواب میں کارندے نے کچھ کہنا شروع کیا تھا کہ اس کی آواز ہوا کے شور میں دب گئی۔ گرم تھپیڑوں نے میرا اپنی جگہ پر جمے رہنا دشوار کر دیا لیکن میں نے سلطانی کاغذوں کو دونوں ہاتھوں سے دبا کر خود کو پتھر کے مہرے کی طرح فرش پر جما لیا۔ مجھے اس کی اچھی مشق تھی، لیکن اڑتی ہوئی ریت سے یہ میرا پہلا سابقہ تھا۔ کرکراتے ہوئے ذرّے

مجھے اپنے بالوں میں اور گردن سے ہو کر پیٹھ تک اترتے معلوم ہوئے۔ دھوپ جگہ جگہ سے دھندھلا گئی تھی اور ریت کا بادل جو دور پر اٹھا تھا، فصیل سے قریب قریب مل گیا تھا۔ ہوا کا اثر اس پر بھی تھا۔ وہ کبھی دبتا کبھی ابھرتا، کبھی اِدھر جھکتا، کبھی اُدھر، اور کبھی اپنی جگہ پر ایک بہت بڑے بگولے کی طرح گھومنے لگتا تھا۔ پھر اس کے پیچھے سے کئی تیر آئے اور سلطان کے پیروں کے پاس گر گئے۔ سلطان نے اسی سکون کے ساتھ جو خطرناک معرکوں میں ہمیشہ اس کے چہرے پر نظر آنے لگتا تھا، جھک کر ایک تیر اٹھایا اور کچھ دیر تک اس کے پھل کو الٹ پلٹ کر دیکھتا رہا۔ اس نے باقی تیروں کو اپنی جگہ پر کھڑے کھڑے ایک نظر دیکھا اور ہاتھ والا تیر کارندے کی آواز کی طرف پھینک کر بولا:

"اس پر خون کیسا ہے؟"

کچھ دیر بعد کارندے کی آواز آئی:

"یہ ہمارا تیر ہے اور خون شاید...."

لیکن اچانک اس کی آواز میں کئی اور انسانی آوازیں شامل ہو گئیں، اور اسی وقت مجھے فصیل پر صحرائی پرندوں کا جھرمٹ سا نظر آیا۔ کارندے کی آواز کی طرف سے تیروں کی سنسناہٹ سنائی دی اور پردوں سے کئی گچھے تھوڑے بلند ہو کر فصیل کے پیچھے الٹ گئے لیکن اتنی ہی دیر میں مجھے ان کے نیچے آدمیوں کے چہرے نظر آ گئے تھے۔ پھر سلطان کی آواز بلند ہوئی:

"ان کی کلغیاں کن پردوں کی ہیں؟"

اسے کوئی جواب نہیں ملا، اور اس کی آواز پھر بلند ہوئی:

"یہ کن کے پر ہیں؟"

جواب میں کمانوں کی ترنگ اور تیروں کی سنسناہٹ سنائی دی اور فصیل کے پیچھے پردوں کی کلغیاں جلدی جلدی ابھرنے اور غائب ہونے لگیں۔

"اب کیا حال ہے؟" سلطان نے پکار کر پوچھا لیکن وہ شاید ایسے موقعوں پر جواب

نہ پانے کا عادی تھا۔ وہ آہستہ آہستہ بڑھتا ہوا زمین پر پڑی ہوئی عورت کے سرہانے پہنچا، کچھ دیر تک اسے غور سے دیکھتا رہا، پھر جھکا اور عورت کو ایک ہاتھ میں قریب قریب لٹکائے ہوئے اٹھا۔

"سب تیرے لیے"، اس نے غراتی ہوئی سرگوشی میں کہا، "سب تیرے لیے۔"

اس کی سرگوشی مجھ کو ہول کے شور کے باوجود سنائی دی اور اس وقت میری نظر پہلی بار عورت کے پورے کھلے ہوئے چہرے پر پڑی۔ شاید بند آنکھوں کی وجہ سے وہ مجھے مری ہوئی سی معلوم ہوئی۔ سلطان اس کو لیے ہوئے اس طرف گھوما جدھر سے کارندے کی آواز آتی تھی۔

"اسے چھت کے نیچے کھینچ لو"، اس نے پوری آواز سے کہا۔

عورت کا بدن ہلکے سے تھرتھرایا اور اس نے آنکھیں کھول دیں۔ کچھ دیر تک وہ بے تعلقی کے انداز میں سلطان کے چہرے کی طرف دیکھتی رہی۔ سلطان کی گھورتی ہوئی آنکھوں میں اچانک پیدا ہو جانے والی سفاکی نے بہ ظاہر اس پر کوئی اثر نہیں کیا۔ اس نے آہستگی لیکن مضبوطی کے ساتھ خود کو سلطان کی گرفت سے چھڑایا اور ہلکے قدموں سے کارندے کی آواز کی سمت چلی، لیکن سلطان نے بڑھ کر اتنی ہی آہستگی اور مضبوطی کے ساتھ اسے پکڑ لیا اور پھر پوری آواز سے کہا:

"رسیاں پھینکو۔"

اس کی بات پوری بھی نہیں ہوئی تھی کہ دو تین رسیوں کے سرے اس کے قدموں میں آ کر گرے۔ اس نے عورت کی کمر اور شانوں کو کس کر باندھ دیا۔ مجھے زیوروں کی ہلکی کھنک سنائی دی، پھر میں نے رسیوں کو تنتے دیکھا، لیکن اسی کے ساتھ میری نظر فصیل کی طرف اٹھ گئی۔ ریت کا بادل فصیل کے اوپر رکھا ہوا معلوم ہو رہا تھا، تیروں کی آواز ہوا کی آواز پر غالب تھی اور بادل کے پیچھے ابھرتے اور غائب ہوتے ہوئے

پروں کے گچھے صاف نظر نہیں آتے تھے۔ میں نے پھر چھت کو دیکھا۔ سلطان وہاں تنہا کھڑا ہوا تھا۔ ایک ہاتھ دوسرے شانے پر رکھے ہوئے وہ کسی خبر کا منتظر معلوم ہوتا تھا۔

اُس وقت مجھے لمحہ بھر کو وہم سا ہوا کہ میں خواب دیکھ رہا ہوں لیکن اُسی لمحے ہوا کا ایک تھپیڑا میرے منھ پر پڑا اور گرم ریت میری کھلی ہوئی آنکھوں میں گھس گئی۔ میں نے سر جھکا لیا اور اپنی آنکھوں سے پانی بہنے دیا یہاں تک کہ اُس کے ساتھ ریت کے سارے ذرّے نکل گئے اور میں پھر سے دیکھنے کے قابل ہوا۔ اتنی ہی دیر میں ہوا دھیمی ہو گئی تھی، ریت کا بادل غائب تھا اور فصیل کے پیچھے خاموش آسمان کے سوا کچھ نہ تھا۔ سلطان اسی طرح چپ چاپ کھڑا تھا۔ آخر کارندے کی آواز آئی جس کے ساتھ کئی آوازیں شامل تھیں جو سلطان کو مہم کے سر ہونے کی مبارکباد دے رہی تھیں۔ سلطان نے ایک ہاتھ اوپر اٹھا کر مبارکباد قبول کی، مڑ کر فصیل تک گیا، کچھ دیر تک باہر دیکھتا رہا، پھر بولا:

"صحرا ہی صحرا!"

اور مجھے پھر گمان ہوا کہ وہ مجھ سے مخاطب ہے، اور چھت پر سلطان کے سوا کسی اور کو نہ دیکھ کر مجھے اپنا گمان یقین میں بدلتا محسوس ہوا لیکن وہ میری جانب نہیں دیکھ رہا تھا۔

"سب حکم کے منتظر ہیں"، کارندے کی آواز نے کہا۔

"واپسی"، سلطان نے جواب دیا، پھر ذرا رک کر بولا، "اور اسے بتا دو، وہ بھی ساتھ جائے گی۔"

"وہ ..." کارندے کی دہشت زدہ آواز آئی، "... وہ ختم ہو گئی۔"

سلطان نے فصیل سے پیٹھ لگالی۔

"کس طرح؟" اس نے پوچھا۔

"کچلی گئی۔"

"کیا کوئی چھت گر گئی؟" سلطان نے پوچھا اور کئی قدم آگے بڑھ آیا۔

"چھتیں اپنی جگہ پر ہیں"، آواز آئی، "لیکن وہ کچل کر مری ہے۔ اس کے چہرے سے ایسا ہی معلوم ہوتا ہے۔ اس کا چہرہ۔۔۔"

"۔۔۔ واپسی"، سلطان نے بات کاٹ کر کہا، "رات ہونے سے پہلے قلعہ خالی ہو جائے۔"

"اور وہ؟"

سلطان نے آواز کی طرف دیکھا، میرے برج کی طرف دیکھا، گردن موڑ کر فصیل کی طرف دیکھا، پھر شفاف آواز میں بولا:

"اُسے صحرا میں ڈال دو۔ کچھ دن میں وہ پھر ریت ہو جائے گی۔"

(۵)

نکلتے ہوئے سورج کی روشنی مجھے ریت کی لہروں پر دوڑتی دکھائی دی۔ مقبرہ میرے سامنے تھا۔ رات بھر خنکی میں پتھر پر بیٹھے بیٹھے میرا جسم اکڑ گیا تھا۔ میں نے دھوپ کے کچھ تیز ہونے کا انتظار کیا اور جب میرا بدن ذرا گرم ہو گیا تو میں نے ایک بار پھر مقبرے کو قریب سے جا کر دیکھا۔ واپسی کے راستے کو دھیان میں رکھتے ہوئے میں اس کے پھاٹک میں داخل ہوا اور نیم دائرے میں بنی ہوئی آخری دیواروں تک پہنچ گیا۔ ایک دیوار پر مجھے شبہ ہوا کہ اس میں اُس برج کے پتھر استعمال ہوئے ہیں جس کے فرش پر مجھ کو صحرائی مہم کی واقعہ نویسی کے لیے بٹھایا گیا تھا۔ وہاں میں نے کچھ نہیں لکھا تھا۔ صحرائی مہم کی روداد میں نے اپنے گھر کے باغ میں بیٹھ کر لکھی تھی جہاں اس وقت تک کوئی بھی سایہ دار درخت نہیں تھا۔ اور اس روداد میں زیادہ تر سنی ہوئی باتیں تھیں جن کو میں نے آنکھوں دیکھے منظروں کی طرح بیان کیا تھا، مگر اس میں وہ بھی تھا جو میں نے برج میں بیٹھے بیٹھے اپنی آنکھوں سے دیکھا تھا جس کی وجہ سے ایک سلطانی مورخ کو جو میرا واحد

دشمن تھا، مرنا پڑا تھا۔

اور اب مجھے اس مقبرے کی تعمیر کا واقعہ لکھنا تھا جسے میں نے تعمیر ہوتے نہیں دیکھا تھا۔ اس کے بننے کا حال مجھے نگراں نے بتایا لیکن اس کو بنا ہوا میں اپنی آنکھوں سے دیکھ رہا تھا۔ مجھے نیا سلطانی مؤرّخ اور اس کی کم عمری یاد آئی اور میں آہستہ آہستہ چلتا ہوا مقبرے کے پھاٹک سے باہر آگیا۔ چبوترے پر سے مقبرے کی کٹاؤدار چھت، جو نہیں تھی، خوبصورت معلوم ہو رہی تھی۔ میں دوسری طرف کی سڑک پر اترا۔ راستے میں مجھے لوگوں کے چھوٹے چھوٹے جتھے ملے جو دور دور سے مقبرے کی سیر کو آرہے تھے۔ میرے اوپر صحرائی پرندوں کے جھُنڈ تھے جو شہر کی جھیلوں کی طرف جا رہے تھے۔ میں کسی بھی طرف دیکھے بغیر بڑے بازار اور چھوٹے بازاروں سے ہوتا ہوا اپنے گھر میں داخل ہو گیا جہاں سلطان کا کارندہ میرا انتظار کر رہا تھا۔ اس نے سلطان کے مہری کاغذوں کا پلندہ میرے ہاتھ میں تھما دیا۔ ہم دونوں نے ایک ساتھ کاغذوں کو گنا اور کارندہ واپس چلا گیا۔

یہ سب شروع سے آخر تک میں نے سلطان کے مہری کاغذوں پر لکھا ہے جو گن کر مجھ کو دیے گئے ہیں اور گن کر مجھ سے لیے جائیں گے۔ واقعہ نویس کا سلطانی کاغذوں کو اپنے مصرف میں لے آنا ایک نیا جرم ہے جس کی سزا ابھی نئی ہونا چاہیے۔ سلطان کو سزائیں ایجاد کرنے کا سلیقہ بھی ہے اور میں نے ان سزاؤں کی بھی واقعہ نویسی کی ہے۔ لیکن اب مجھ کو حکم ہوا ہے کہ سلطان کے مقبرے کی تعمیر کا واقعہ لکھوں، اور میں سمجھتا ہوں کہ میں نے اس حکم کی بھی تعمیل کر دی ہے اگرچہ خانہ نشینی کے دوران کی بہت سی باتوں کے ساتھ میں واقعہ نویسی کے قاعدے بھی بھول سا گیا ہوں۔ اپنی خانہ نشینی کی مدّت بھی میں نہیں

بتا سکتا، لیکن اس ساری مدت کا حاصل چھتری کی شکل کا یہ درخت ہے جس کے نیچے میں نے بہت آرام کیا ہے۔ اس کی جڑ سے لے کر پھول تک، اور پھل کے چھلکے سے لے کر گٹھلی کے گودے تک ہر چیز میں زہر ہی زہر ہے۔ شاید اسی لیے اس کے سائے میں نیند آتی ہے۔

# جرگہ

Surely we are all mad people, and they
Whom we think are, are not.

CYRIL TOURNEUR

چو گنج اند آن عزیزان در خرابی — طلب کن گنج پنہاں تا بیابی
در این گنج را بر تو گشادم — کلیدِ گنج در دستِ تو دادم

(ناصر خسرو)

# جبر گہ

بڑا سا سیاہ ہاتھ کاغذ پر سے ہٹا اور موٹی انگلی، جس میں چاندی کا باریک سا چھلا پڑا ہوا تھا، تحریر کے ایک ایک لفظ پر رُک رُک کر آگے بڑھنے لگی۔

"مکرّمی زاد لطفکم

گزارش خدمت عالی میں یہ ہے کہ آج مجھے آپ کی لکھنؤ آمد کا علم ہوا نیز یہ بھی معلوم ہوا کہ آپ میرے دادا جان مرحوم کے دیرینہ آشناؤں میں ہیں اور ہم لوگوں کے حالات سے بہ خوبی واقف ہیں آپ کو یہ بھی معلوم ہوگا کہ والدِ مرحوم کی وفات کے بعد بھائی صاحب قبلہ اور ان کی اہلیہ نے مجھ یتیم کے ساتھ کس قسم کا سلوک روا رکھا ہے۔ مجھ کو جوع البقر کا مریض کہہ کر بدنام کرتے ہیں اور پیٹ بھر کھانا نہیں دیتے ہیں اور کبھی کبھی مجھے کھانے میں زہر ملا کر دیتے ہیں تاکہ میں کھاؤں تو مر جاؤں۔ اور محلے کے سب دکان داروں کو منع کر دیا ہے کہ مجھے سودا نہ دیا کریں۔ اور میرے بہنوئی صاحب بھی مجھے بدنام کرتے ہیں۔ اللہ نے چاہا تو ان سے اچھی طرح سمجھوں گا۔ اور ان کے چھوٹے بھائی صاحب بھی مجھے بدنام کرتے ہیں۔ اور ان دونوں نے اپنے جاسوس میرے

پیچھے لگا رکھے ہیں۔ اور بھی میرے بہت سے دشمن ہیں۔ آج سویرے آپ کی آمد کی خبر ملتے ہی میں آپ سے ملنے آ رہا تھا تو دشمن ایک ٹرک پر میرا پیچھا کرتے ہوئے آئے تھے تو میں آپ سے ملے بغیر چھوڑے کی گلی سے لوٹ آیا۔ اور میرے بہت سے دشمن ہیں جن کے جاسوس ہر وقت میری نگرانی کیا کرتے ہیں۔ کبھی فقیروں اور کبھی ہجڑوں کے بھیس میں میرے مکان کے آس پاس ٹہلتے رہتے ہیں۔ لیکن خدا کی قسم میں ڈرتا نہیں ہوں۔ مائنڈ ٹھیک ہو جائے تو ایک ایک کو مزہ چکھاؤں گا۔ میری بھی بہت بڑی پارٹی ہے اور میں برابر اپنی پارٹی کے آدمیوں کے پیغام وصول کرتا رہتا ہوں۔ میں ایک ایک سے سمجھوں گا۔ اور آپ کو بتاؤں کہ میرے بہنوئی صاحب دہریے ہیں جن کے بارے میں خداوند عالم ارشاد فرماتا ہے کہ کہتے ہیں ما یھلکنا الا الدّھر ہمیں نہیں ہلاک کرتا مگر زمانہ۔ اور میرے بہنوئی صاحب اپنی غیر موجودگی میں میری ہمشیرہ کو مجھ سے ملنے نہیں دیتے ہیں۔ انھیں ڈر ہے کہ وہ مجھے کچھ کھلا پلا نہ دے۔ اور ان کے چھوٹے بھائی صاحب بھی مجھے بدنام کرتے ہیں اور مجھے مفت خور کہتے ہیں۔

اگر میرا مائنڈ ٹھیک ہو جائے تو میں کہیں نوکری کر لوں یا ٹیوشن پڑھانے لگوں تاکہ کسی کی محتاجی نہ رہے۔ محتاجی بری چیز ہے۔ اللہ آپ کو کسی کا محتاج نہ کرے۔ آپ میرے حال پر صرف اتنی عنایت فرمائیں کہ کسی وزیر یا افسر اعلیٰ کے نام ایک پرچہ لکھ دیں تاکہ وہ کچھ ایسا بندوبست کر دیں کہ میرا مائنڈ ٹھیک ہو جائے۔ میرے مائنڈ میں کوئی خرابی نہیں ہے۔ صرف کچھ سوچتا رہتا ہوں۔ اور جب بولنے لگتا ہوں تو جب کبھی

میرا سر گرم ہو جاتا ہے تو میں رُک نہیں پاتا۔ چاہتا ہوں کہ نہ بولوں مگر بولتا رہتا ہوں۔ آپ یہ سب باتیں اپنی سفارشی چھٹی میں لکھ دیجئے اور یہ بھی کہ اگر میرا مائنڈ ٹھیک ہو جائے تو میں لکھنے پڑھنے کا کام ٹیوشن وغیرہ کر سکتا ہوں۔ و نیز یہ بھی کہ میں نے حیدری اسکول میں کچھ دن پڑھایا ہے اور میرا مائنڈ جب بھی ایسا ہی تھا مگر جب بھی میں نے بہت اچھی طرح پڑھایا۔ نئے ہیڈ ماسٹر صاحب نے جھوٹے الزام لگوا کر مجھے الگ کرا دیا اس لیے کہ اُن کے والد صاحب میرے والد صاحب کے مخالف تھے۔ تو جب میں نے مائنڈ ٹھیک نہ ہونے پر ٹھیک سے کام کیا تو جب مائنڈ ٹھیک ہو جائے گا تو اور بھی ٹھیک سے کام کروں گا۔ مہربانی کر کے یہ سب باتیں تفصیل کے ساتھ لکھ دیجئے گا۔ اللہ آپ کو جزائے خیر دے گا۔ یا آپ خود ہی ایک سرٹیفکٹ لکھ دیجئے کہ میرا مائنڈ ٹھیک ہو سکتا ہے۔ آپ کا سرٹیفکیٹ میرے بہت کام آئے گا۔

زیادہ کیا لکھوں۔ مجھ کو معلوم ہوا ہے کہ حویلی پہلے آپ کے خاندان کی تھی۔ میرا مائنڈ ٹھیک ہوتا تو کوشش کرتا کہ وہ آپ کو واپس مل جائے۔

فقط بدنصیب

ارشاد احمد

سیاہ ہاتھ نے کاغذ کو ڈھانپ لیا۔

(۲)

ایک آئس کریم والا اپنی گاڑی ڈھکیلتا سڑک کے مغربی سرے کی اُس گلی میں غائب ہو گیا جس کے نام کا پتھر اُدھے سے زیادہ ٹوٹ کر نابود ہو چکا تھا اور اُس کے باقی ماندہ حصے

پر صرف "گلی" کا لفظ باقی رہ گیا تھا۔ سڑک صاف تھی اور دور تک سیدھی چلی گئی تھی تھوڑے تھوڑے فاصلے پر لگے ہوئے گھنے سایہ دار درختوں کے گرے ہوئے پتے کنارے کنارے ایک ترتیب کے ساتھ ڈھیر تھے اور ان پر جمی ہوئی گرد چھینٹوں کے نشانوں سے داغ دار تھی۔ سڑک بھی ایسا معلوم ہوتا تھا کہ کچھ دیر پہلے گیلی ہوگی۔ حالاں کہ بارش نہیں ہوئی تھی۔ سناٹے کی کیفیت معمول سے کچھ زیادہ تھی اس لیے کہ ابھی شام نہیں ہوئی تھی۔ لیکن اب دور سے خاموشی کو توڑنے والی ایک آواز آنا شروع ہوئی۔ یہ ایک رکشا تھا جس کے اندر کوئی شخص بیٹھا ہوا یکساں رفتار سے ڈھول پیٹ رہا تھا۔ تھوڑے تھوڑے وقفے کے بعد رکشے میں سے گلابی رنگ کے پرچے باہر نکل کر منتشر ہوتے اور ہوا اُن کو رکشے سے آگے اُڑا لے جاتی۔ دیکھتے دیکھتے ماحول میں تبدیلی پیدا ہوئی۔ اس لمبی سڑک پر پھوٹنے والی گلیوں کے دہانوں سے مختلف نمونوں کے بچے نمودار ہوئے اور پرچے لوٹنے کے لیے رکشے کی طرف دوڑ پڑے۔ زمین پر لوٹتے ہوئے پرچے آناً فاناً چن لیے گئے اور اب رکشے کے گرد بچوں کا انبوہ ہو گیا۔ اس ہجوم میں گھرا ہوا رکشا دور پر ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے مٹھائی کے ٹکڑے پر چیونٹوں کا حملہ ہوا ہو۔

رکشے میں سے ایک اور گلابی رنگ کا پرچہ باہر نکل کر ہوا میں اٹھا اور بچوں کے سروں پر سے ہوتا ہوا آگے بڑھنے لگا۔ اسی کے ساتھ رکشے کی رفتار تیز ہوئی اور ٹھیک اسی وقت رکشے کے قریب والی گلی سے ایک برقع پوش عورت برآمد ہوئی۔ ہوا میں پھڑپھڑاتے بدرنگ برقعے کو سنبھالتی ہوئی وہ آگے بڑھی۔ رکشے کے بالکل سامنے اڑتے ہوئے پرچے کو اس نے اناڑی پن کے ساتھ دونوں ہاتھوں سے پکڑنے کی کوشش کی اور اس کوشش میں رکشے کو فراموش کر گئی۔ اگلے پہیے کی ہلکی سی ٹکر سے وہ زمین پر آ رہی اور دو لوٹیں لگا کر پھرتی کے ساتھ اٹھ کھڑی ہوئی۔ پرچہ اس کے ہاتھوں سے نکل کر آگے بڑھ چکا تھا اور اس مجمعے کی زد سے باہر سڑک پر تنہا چلا آ رہا تھا۔ ڈھول کی آواز اور رکشے کی پیش قدمی رک گئی اور اب عورت ہاتھ نچا نچا کر رکشے والے سے لڑ رہی تھی۔ دور سے اس کی آواز نہیں سنائی دے رہی تھی لیکن اس کے ہاتھوں

کی جنبشیں یہ سمجھنے کے لیے کافی تھیں کہ اس کی زبان سے کس نوعیت کے لفظ ادا ہو رہے ہیں۔

"گلی" میں سے ایک شخص آئس کریم کھاتا ہوا باہر سڑک پر آیا۔ وہ دو انگلیوں سے آئس کریم کے چپٹے تنکے کو بہت سنبھال کر پکڑے ہوئے آہستہ آہستہ آگے بڑھ رہا تھا۔ دودھیا آئس کریم تیزی سے گھل رہی تھی اور وہ تھوڑی تھوڑی دیر بعد منہ اوپر اٹھا کر گھلتی ہوئی آئس کریم کے قطرے اپنی زبان پر ٹپکا لیتا تھا، پھر آئس کریم کو پیار بھری نظروں سے دیکھ کر شاید یہ اندازہ کرتا تھا کہ اب وہ کتنی باقی رہ گئی ہے۔ پھر وہ دودھ کے قطروں کو آئس کریم کے سرے تک آنے دیتا اور پھر جلدی سے سر پیچھے کر کے آئس کریم کو اپنے کھلے ہوئے منہ کے اوپر لٹکا لیتا۔ اُس نے بالوں کو خوب تیل اور پانی چپڑ کر پیچھے کی طرف سنوار رکھا تھا جس کی وجہ سے اس کا چہرہ بہت مسّا ہوا معلوم ہوتا تھا۔

"چلی آ!" اس نے رازدارانہ لہجے میں آئس کریم سے کہا اور منہ اوپر اُٹھا دیا۔ لیکن اب اُس کے ہاتھ میں خالی تنکا تھا۔ اس کے چہرے پر ایک بادل سا آکر چلا گیا۔ اُس نے تڑپ کر پہلے اوپر، پھر نیچے نظر کی اور دیکھا کہ آئس کریم زمین پر گر کر خود اُسی کے پیر تلے کچل گئی ہے۔ اس کی نگاہوں میں پل بھر کو مایوسی جھلکی اور غائب ہو گئی۔ اس نے آئس کریم کے چپٹے تنکے کو جلدی جلدی دو تین بار چوسا، پھر اسے پھینک کر گلی کی طرف لپکا۔

"او بھائی!" اس نے قمیص کی جیب میں ہاتھ ڈالتے ہوئے آواز دی، "او بھائی آئس کریم!"

لیکن خود بہ خود اُس کے قدم ڈھیلے پڑ گئے۔ اس نے جیب سے ہاتھ نکال لیا اور کچھ دیر تک سُن کھڑا رہا۔ اچانک اُس کی آنکھیں سُرخ ہو گئیں۔ نیچ سڑک پر آکر اُس نے

آسمان کی طرف دیکھا۔ آسمان پر نظریں جمائے جمائے وہ دو تین قدم ایک طرف ہٹا۔ پھر دوسری طرف، پھر تیسری طرف، جیسے جگہ کا تعین کر رہا ہو۔ آخر ایک جگہ پر وہ جم کر کھڑا ہو گیا۔ اس نے اپنا سر تھوڑا اور اونچا کیا جس کی وجہ سے اس کی گردن بہت پتلی معلوم ہونے لگی۔

"ایک!" وہ چیخا، "اتر نیچے!"

پھر وہ آئس کریم کے دھبّے کے پاس پہنچا۔ زمین پر جھک کر اس نے دھبّے کے گرد انگلی سے دائرہ بنایا، پھر سینے پر ہاتھ باندھ کر سیدھا کھڑا ہو گیا۔ اُس کی آنکھیں بند ہوئیں اور رٹے ہوئے سبق کی طرح منھ سے لفظوں کا فوّارہ سا جاری ہو گیا۔ بہت پیچھے برقع پوش عورت کے ہاتھوں کی جنبشیں ان لفظوں سے ہم آہنگ ہو رہی تھیں۔ لیکن آخر وہاں کا جھگڑا ختم ہوا۔ رکشا آگے بڑھا اور ڈھول پھر پٹنے لگا۔ اس کے ساتھ ہی سڑک پر کھڑے ہوئے اس شخص کی حالت میں تغیّر پیدا ہوا۔ اُس کے ہونٹ بھنچ گئے، آنکھیں کھلیں، پھیلیں اور سکڑ گئیں۔ اُس نے گردن گھما کر رکشے کی طرف دیکھا۔ عورت کے ہاتھ سے نکلا ہوا گلابی پرچہ زمین پر لوٹتا ہوا سیدھا اس کی طرف چلا آ رہا تھا۔ اُس نے پرچے کو دیکھا اور چوکس ہو کر آگے کو جھک گیا۔ پرچہ اس کے پیروں کے قریب آیا تو اس نے جھپٹ کر اسے مٹھی میں دبوچ لیا۔ دہشت زدہ نظروں سے چاروں طرف دیکھ کر اس نے پرچہ اپنی جیب میں رکھ لیا۔ اب اس کی نظریں قریب آتے ہوئے رکشے پر لگی ہوئی تھیں۔ ڈھول کی آواز کو وہ بڑے انہماک سے سن رہا تھا اور اس کا سر دھیرے دھیرے یوں ہل رہا تھا جیسے ڈھول پر پڑنے والی ایک ایک ضرب کا مطلب اس کی سمجھ میں بہ خوبی آ رہا ہو۔ رکشا اس کے قریب آ کر گزر گیا لیکن اس کی محویت میں فرق نہ آیا۔ اُس نے سیاہ رنگ کی اس کار کی طرف بھی توجہ نہیں کی جو ابھی ابھی اس کے قریب آ کر رُکی تھی۔

"بھائی صاحب، ذرا سنیئے گا" کار کے اندر سے کسی نے کہا مگر اس نے نہیں سنا۔ جب تیسری بار اُسے آواز دی گئی تو وہ مڑا۔ اس نے ایک نظر کار کی طرف دیکھا اور بیزاری کے انداز میں ہاتھ جھٹکنے لگا۔ کار آگے بڑھ گئی اور وہ پھر ڈھول کی ڈوبتی ہوئی آواز میں گم ہو گیا۔ لیکن اب سڑک پر آمد و رفت بڑھنے لگی تھی۔ سواریوں اور راہ گیروں میں سے بیشتر کا رُخ اسی طرف تھا جدھر وہ سیاہ کار گئی تھی۔

بائیسکلوں پر سوار تین لڑکے اس کے قریب سے ہو کر گزرے اور تھوڑا آگے بڑھنے کے بعد چکر کاٹ کر واپس آ گئے۔ انھوں نے اسے اپنے گھیرے میں لے لیا اور کچھ دیر تک اس کی محویت کو دلچسپی سے دیکھتے رہے۔ پھر باتیں شروع ہوئیں۔

"ارشاد بھائی! غضب خدا کا، ہم سارے شہر میں تمھیں ڈھونڈتے پھر رہے ہیں اور تم یہاں آگے ہوئے ہو۔"

"ارشاد بھائی!"

"ارشاد بھائی! آج کن دنیاؤں کی سیر کر رہے ہو؟"

"ارشاد بھائی صاحب!"

آخر وہ چونکا۔ کچھ دیر تک قدرے حیرت سے ایک ایک کا منھ تکتا رہا، پھر اُس کی آنکھوں میں شناسائی کی چمک پیدا ہوئی اور اس نے کوئی نہایت اہم خبر سنانے کے انداز میں انھیں بتایا:

"پیغام آ رہا تھا!"

"پیغام؟ اچھا! واقعی؟"

"خدا کی قسم۔ یہ دیکھو" اس نے جیب سے گلابی پرچہ نکالا "یہ بھی آیا ہے!"

"دیکھیں دیکھیں، کہاں سے ملا؟"

اُس نے سڑک پر پڑے دھبّے کی طرف اشارہ کیا اور اچانک مغموم ہو گیا۔

"ہماری آئس کریم گر گئی" اس نے گلوگیر آواز میں کہا۔

"آئس کریم گر گئی؟ غضب ہو گیا!"

"آدھی سے زیادہ باقی تھی۔"

"اوہو! یعنی عین جوانی میں؟ خیر غم نہ کرو ارشاد بھائی۔ یہ بتاؤ کتنی آئس کریم کھاؤ گے؟"

دوسرا لڑکا بولا:

جانتے ہو ہم کہاں جا رہے ہیں؟ منظور صاحب کے یہاں!"

"منظور صاحب کے یہاں؟"

"منظور صاحب کے یہاں! آج حویلی کا افتتاح ہے۔"

"حویلی کا افتتاح؟"

"حویلی کا افتتاح! اور اس خوشی میں ایک زبردست دعوت ہے۔"

"دعوت؟"

"دعوت! اور منظور صاحب نے کہا ہے۔۔۔ کیا کہا ہے، اشتیاق؟"

"کہا ہے چاہے خود نہ آنا مگر ارشاد کو ضرور لانا۔"

"مجھ کو؟"

"تم کو! پس آجاؤ برادر۔ گھومتے ہوئے چلیں گے۔"

ان میں سے ایک نے اس کو اپنے آگے بائیسکل کے ڈنڈے پر بٹھالیا۔

(۳)

"گلی" والی سڑک ختم ہوتے ہوتے بائیں ہاتھ پر سڑک سے کچھ پیچھے ہٹا ہوا پرانی وضع کا وہ پھاٹک بہت زیادہ نیا معلوم ہو رہا تھا۔ اس کے آس پاس بڑی چہل پہل تھی۔ لوگ چھوٹے چھوٹے جھتوں کی شکل میں اندر داخل ہو رہے تھے اور

داخل ہونے سے پہلے اُن کی نگاہیں پھاٹک پر ضرور ٹھہرتیں۔ وہ پورے پھاٹک کا جائزہ لیتے اور آپس میں باتیں کرتے ہوئے اس میں سے گزر جاتے۔ بعض اس کے نیچے سے گزرتے وقت سر اٹھا کر اس کو دیکھتے رہتے اور بعض کوشش کر کے اس کو نظر انداز کرتے معلوم ہوتے۔ زیادہ تر ایسے تھے جن کی نظریں دور ہی سے اُس پر جم جاتیں اور وہ دیکھتے کہ ڈوبتے ہوئے سورج کی نارنجی روشنی اس کے دُہرے مرمریں ستونوں کے نقش و نگار کو ابھار رہی ہے اور اس میں جڑے ہوئے رنگین بلّور کے ٹکڑوں کی اقلیدسی وضعوں کے ہر رنگ پر بیمار سی دھوپ کا رنگ کچھ کچھ غالب ہے، تین ہلالی محرابوں پر قائم کی ہوئی پھاٹک کی پیشانی پر چاندی یا سفید جلا کی ہوئی کسی اور دھات کی دونوں مچھلیاں کسی وجہ سے متحرک معلوم ہو رہی ہیں اور اُن کی سرخ شیشے کی بے جان آنکھوں میں روشنی کا انعکاس نارنجی ہے، اور اس سے بھی زیادہ تیز انعکاس پیتل کے اُس چمکیلے مخروطی کلس پر ہے جو پھاٹک کی پیشانی پر جمے ہوئے سنگِ سیاہ کے ایک مثلّث کے اوپر اٹھا ہوا ہے۔

کچھ اور قریب آنے پر وہ دیکھتے کہ شیشے، پتھر اور دھاتوں کے کاریگروں نے اس پھاٹک میں جو صناعی دکھائی ہے وہ دور سے پوری طرح نظر نہیں آ رہی تھی۔ اب اُن کو وضعوں کے اندر وضعیں دکھائی دیتیں اور جب وہ ان باریکیوں کو غور سے دیکھتے ہوئے پھاٹک کے بالکل قریب پہنچ جاتے تو ان کو سنگِ مرمر کے ستونوں پر مٹی کے ذرّے چپکے ہوئے نظر آتے۔ پھر وہ دیکھتے کہ یہ ذرّے ستونوں کی سفید آب دار سطح میں دھنس گئے ہیں۔

حویلی اس پھاٹک کے پیچھے تھی۔ لیکن اس سے پہلے حویلی کے آگے یہ پھاٹک نہیں تھا۔ کل رات تک بھی یہ پھاٹک یہاں پر نہیں تھا۔ لیکن اب یہ بنا بنایا سڑک سے کچھ فاصلے پر موجود تھا۔ حویلی اس کے پیچھے نظر نہیں آتی تھی لیکن حویلی کا مالک اس کے

آگے کھڑا ہوا آنے والوں کا استقبال کر رہا تھا۔ وہ ہر آنے والے سے دو تین جملوں میں بات کرتا پھر ایک طرف ہٹ کر پھاٹک کی جانب اشارہ کرتا۔ اِس طرح مہمانوں کا ایک سلسلہ پھاٹک کے نیچے سے گزر رہا تھا۔ یہ سلسلہ ذرا ذرا دیر کے لیے رک بھی جاتا تھا۔ ایسے ہی ایک موقعے پر اُس نے پھاٹک کے ایک ستون پر ہلکے سے انگلی پھیری، پھر انگلی کو آنکھوں کے قریب لا کر غور سے دیکھا، پھر انگوٹھے اور انگلی کو دو تین بار ملا کر دبایا۔ اسی وقت ایک نوجوان تیز چلتا ہوا پھاٹک میں داخل ہونے لگا۔ اس نے نوجوان کو کنکھیوں سے دیکھا اور آہستہ سے پکارا:

"مُنیر شاہ صاحب!"

"جی، ابّو؟" نوجوان فوراً رک کر پلٹا۔

"کہاں؟"

"ابّو، وہ آئس کریم شاید۔۔۔"

"آگئی ہے،" اُس نے بتایا، پھر پوچھا، "دوا کھائی؟"

"دوا تو۔۔۔ ابّو۔۔۔"

"جی ہاں، جی ہاں"، اس نے جیب سے ایک چھوٹی شیشی نکال کر نوجوان کی طرف بڑھائی۔

"کمال ہے، ابّو،" نوجوان نے شیشی لیتے ہوئے کہا، "آپ کبھی بھولتے نہیں۔"

"ستائیس منٹ بعد"، اس نے کلائی کی گھڑی دیکھتے ہوئے کہا "اس کے بعد سوتے وقت۔"

"ٹھیک ہے ابّو"، نوجوان نے بھی گھڑی دیکھتے ہوئے کہا۔

وہ مڑ کر پھاٹک کی طرف چند قدم چلا تھا کہ اُسے باپ کی آواز پھر سُنائی دی:

"شیشی مجھے دیں گے؟"

نوجوان واپس پلٹا۔

"مجھے یاد رہے گا، ابّو" اس نے تقریباً ٹھنکتے ہوئے کہا، "سوتے وقت بھی تو۔۔۔"

لیکن باپ نے اُس کی طرف ہاتھ بڑھا کر کہا:

"ایک کیپسول نکال لیجیے۔"

اور جب نوجوان شیشی اسے واپس کر رہا تھا تو اس نے بظاہر شیشی کو مخاطب کرتے ہوئے کہا:

"آپ کا جرگہ وقت کا بڑا پابند ہے۔"

اسی وقت مہانوں کا ایک چھوٹا سا جھتا پھاٹک کے نزدیک پہنچا اور اس نے بڑھ کر سب سے فرداً فرداً مصافحہ اور مختصر گفت گو کی۔ مہان پھاٹک میں داخل ہو گئے تو وہ نوجوان کی طرف مڑا۔

"جرگہ، ابّو؟" نوجوان نے قدرے سراسیمہ ہو کر کہا۔

"قریب قریب سب پہنچ گئے ہیں"، باپ نے کہا، "اب آپ اتنا کرم کیجیے کہ سب کو ایک ہی میز پر بٹھائیے اور۔۔۔"

"لیکن ابّو۔ ان میں سے کوئی نہیں آیا ہے۔ آپ نے خود مہانوں کی فہرست۔۔۔"

"ایک ہی میز پر"، باپ نے کہا، "اور خود آپ اُن کی، اور صرف اُن کی، خاطر مدارات کریں گے۔"

"لیکن ابّو، وہ بغیر بلائے نہیں آ سکتے۔"

"کیا میں نے کہا تھا کہ وہ بغیر بلائے آئے ہیں؟"

"ابّو، آپ سے پہچاننے میں غلطی۔۔۔"

"آپ کہنا چاہتے ہیں کہ میں اپنے مہانوں کو نہیں پہچانتا؟" باپ بولا،

"ہو سکتا ہے۔ بہر حال، ان میں سے ایک صاحب نے مجھے بتایا ہے کہ اتنے رقبے کی مار کے لیے کم سے کم تین ردحیں ضروری ہیں، اور وہ مجھے بہت مناسب داموں پر بہت مناسب روحیں سپلائی کر سکتے ہیں۔"

"ظفر صاحب!" نوجوان آنکھیں پھیلا کر بولا۔

"روحوں کا بیوپار، جہاں تک مجھے معلوم ہے، شہر میں ایک ہی صاحب کرتے ہیں۔ اور وہ آپ کی دریافت ہیں۔"

"لیکن ظفر صاحب۔۔۔"

مہمانوں کا ایک اور جتھا قریب آیا۔ باپ اُن سے نپٹ کر پھر نوجوان کی طرف متوجہ ہوا۔

"اگر میں یمن کی شہزادی سے شادی کرلوں تو آپ کو اعتراض تو نہ ہوگا؟"

"بدرالدین!" نوجوان کی آنکھیں اور پھیل گئیں، "لیکن ابو، وہ تو دہلی گئے ہوئے ہیں۔"

"گئے ہوئے تھے"، باپ نے کہا، "وہاں یمن کی شہزادی نے انھیں اغوا کرانے کی کوشش کی تو واپس بھاگ آئے۔ وہ اس سے شادی نہیں کرنا چاہتے۔ اُن کا خیال ہے اگر میں تیار ہو جاؤں۔۔۔"

"یمن کی شہزادی!" نوجوان نہایت سنجیدہ لہجہ بنا کر بولا۔

"انھوں نے یقین دلایا ہے کہ وہ خادمہ بن کر رہے گی۔"

"یمن کی شہزادی!" نوجوان اسی لہجے میں بولا، "ابو، کیا ہو رہا ہے؟"

"دیکھیے دیکھیے، اثر آ رہا ہے"، باپ نے بھی اسی لہجے میں کہا، پھر گھڑی دیکھ کر بولا، "ابھی تک مہاتما گاندھی نہیں آئے۔"

نوجوان چکرایا ہوا نظر آیا، پھر اچھل پڑا۔

"ابو! کیا بابو صاحب بھی۔۔۔؟"

"میں کسی کو پہچانتا کب ہوں؟ بہرحال بتانے والے نے بتایا ہے کہ گگاندھی جی تھوڑی دیر میں پہنچیں گے اور بہادر شاہ ظفر آ گئے ہیں البتہ انھوں نے ڈاڑھی منڈوا دی ہے۔۔۔" اچانک اس کا لہجہ بہت مشفقانہ ہو گیا، "نہیں نہیں، خوشی کو دبانے کی کوشش نہ کیجیے۔"

"ابو، میں پریشانی میں پڑ گیا ہوں۔"

"بلا سبب۔"

"لیکن میں نے انھیں نہیں بلایا، ابو۔"

"کیا میں کہہ رہا ہوں کہ آپ نے انھیں بلایا ہے؟ اور سنیے، اب آپ اس کی تحقیقات نہیں کریں گے کہ ان کو کس نے بلایا۔ بس اتنا خیال رکھیے گا کہ اگر وہ دوسرے مہمانوں کو اپنا ہم راز بنانا شروع کر دیں تو۔۔۔"

"وہ ہر ایک سے کہاں کھلتے ہیں، ابو۔" نوجوان نے شکایتی لہجے میں کہا۔

"آپ جس سے چاہتے ہیں اس سے تو کھلتے ہیں۔"

"میں۔۔۔ ابو۔۔۔ اُن سب کو ایک جگہ جکڑ کر رکھوں گا۔"

"یہی"، باپ نے کہا، "یہی میں عرض کر رہا تھا۔ اور۔۔۔ بس، جائیے۔ آپ کے کرم کا امیدوار ہوں۔ دوامت بھولیے گا۔"

لیکن جب نوجوان پھاٹک کی طرف مڑنے لگا تو اُسے باپ کی آواز پھر سنائی دی۔

"آیئے آیئے" وہ خود کلامی کے انداز میں کہہ رہا تھا، "آپ ہی کی کسر تھی۔"

نوجوان پھر پلٹا:

"ابو؟"

"کچھ نہیں۔ ارشاد احمد صاحب اپنے مانیٹر کے ساتھ تشریف لا رہے ہیں۔"
نوجوان نے دیکھا۔ پھاٹک سے خاصے فاصلے پر سڑک کے کنارے والے چائے خانے کے قریب ایک لڑکے نے ارشاد کو بائیسکل سے اتارا تھا۔ نوجوان بڑبڑایا:

"ارشاد تو آج کل ..."

"ٹھیک ہے۔ آپ اندر تشریف لے جائیں"، باپ نے کہا، "ان کا استقبال میں کر لوں گا۔"

لیکن ارشاد کا رخ چائے خانے کی طرف تھا۔ اس کی چال سے ظاہر ہوتا تھا کہ بائیسکل کے ڈنڈے پر بیٹھے بیٹھے اس کا ایک پاؤں سن ہو گیا ہے۔

(۴)

چائے خانے میں اس وقت دو ہی آدمی تھے۔ ان میں بھی ایک چائے خانے کا مالک تھا۔ اس نے ارشاد کو آتے دیکھا تو بڑے تپاک سے بولا:

"آیئے، ارشاد میاں۔ ایک نان ختائی ہو جائے۔"

"نہیں محمد میاں، آج نہیں۔" ارشاد چائے خانے کے تینوں زینے چڑھ کر بولا:

"خبت سے دے رہا ہوں۔"

"آج نہیں۔"

"لیجیے بھی۔ میں کسی سے کہنے تھوڑی جا رہا ہوں۔"

"آج نہیں۔" ارشاد نے پھر کہا۔ اس کے چہرے پر ہلکی سی مسکراہٹ آئی۔
وہ محمد میاں کی طرف تھوڑا جھکا اور رازدارانہ لہجے میں بولا، "آج آئس کریم ہو گی!"
پھر اس نے پھاٹک کی طرف اشارہ کیا۔

"ہاں! تو آج منظور صاحب کے یہاں دعوت اڑے گی!"

"دعوت نہیں"، ارشاد نے بڑی متانت کے ساتھ کہا، "صرف آئس کریم!"

"اجازت مل گئی؟"

"اجازت کی ایسی کی تیسی! ایک تولے کے ہماری آئس کریم گرا دی ..... محمد میاں، ہمارا سر گرم نہ کرو!"

"آپ بھی ارشاد میاں مذاق کا بُرا مان جاتے ہیں۔ بیٹھیے، چائے دیتا ہوں۔"

"چائے نہیں۔"

"صرف آئس کریم؟"

"صرف!"

"بلاوا تو بھئی ہمارا بھی ہے۔ کارڈ آیا ہے۔"

"تو چلو۔"

"ہم دکان چھوڑ کر کہاں جائیں گے۔"

"اچھا تو ہم چلیں ..... اور ہاں ..." ارشاد جاتے جاتے رکا۔ محمد میاں کے قریب آکر اس نے جیب سے گلابی رنگ کا پرچہ نکالا، "اسے بھی رکھ لینا۔ آج ہی آیا ہے۔"

اس نے پرچہ برتنوں کے چبوترے پر رکھ دیا اور اس میں اس کا ہاتھ چبوترے پر ٹکے ہوئے ایک بڑے سے سیاہ ہاتھ سے قریب قریب چھو گیا۔ تب اس کو چائے خانے میں دوسرے آدمی کی موجودگی کا احساس ہوا۔ اس کا چہرہ ارشاد کی طرف نہیں تھا۔ لیکن ارشاد اس کے چہرے کی طرف دیکھ بھی نہیں رہا تھا۔ اس نے ایک نظر سیاہ ہاتھ کو اور اس کی موٹی انگلی میں پڑے ہوئے چاندی کے باریک چھلّے کو دیکھا پھر بڑی احتیاط کے ساتھ گلابی پرچہ چبوترے پر سے اٹھا کر جیب میں رکھ لیا۔

اس کا بدن دھیرے دھیرے کانپ رہا تھا لیکن اُس نے خود کو سنبھال لیا۔

"اچھا محمد میاں"۔ اس نے چائے خانے کی سیڑھیاں اترتے ہوئے بھرّائی ہوئی آواز میں کہا، "ہم پھر آئیں گے، دیر ہو رہی ہے"۔ اور وہ تیز قدموں سے پھاٹک کی طرف روانہ ہو گیا۔

محمد میاں کچھ دیر تک بے خیالی میں سڑک کی طرف دیکھتا رہا، پھر دوسرے آدمی کی طرف مڑ کر بولا:

"اصل پوچھو نواب، تو حویلی کھنڈر ہو گئی تھی۔"

"یہ ارشاد میاں۔۔۔" دوسرے آدمی نے پوچھا، "مولوی اولاد احمد کے پوتے ہیں؟"

"خوب پہچانا۔"

"اپنے دادا سے ان کی صورت بہت ملتی ہے۔"

"پورے خاندان کا ایک ہی کینڈا ہے۔ اور یہ تو ایسا ہونہار لڑکا تھا۔۔۔ پھر معلوم نہیں کیا اثر ہو گیا۔"

"حویلی۔۔۔" دوسرے آدمی نے کچھ سوچتے ہوئے کہا، "حویلی تو محمد میاں، بہت پہلے ہی کھنڈر ہو گئی تھی۔"

"سچ کہا۔ مگر منظور صاحب کو شاباش ہے۔ پوری حویلی کو صحیح کرا کے دم لیا۔ جب مرمت لگی ہوئی تھی تو کتنے مستری چائے پینے آتے تھے۔ بتاتے تھے مرمت میں جتنا خرچا ہو رہا ہے اتنے میں تین نئے مکان بن جاتے۔ دس دس گنی مکانیت والے۔"

"تو کیوں نہیں بنوا لیے؟"

"بس، یہی دُھن کہ حویلی جیسی تھی ویسی ہی ہو جائے۔ اور تم جانتے ہو آج کل کٹاؤ کا کام۔۔۔"

"مگر سامنا تو ویسا نہیں رہا۔"

"سامنا... ویسا نہیں ہے؟"

"بہت بدل گیا۔"

"لیکن نواب، سامنا خراب بھی بہت ہو گیا تھا۔ اصل کا کچھ پتا نہیں چلتا تھا، ننگی اینٹیں رہ گئی تھیں۔ مگر ایک بات بتاؤں نواب، اگر آج انھیں ٹھیک ٹھیک معلوم ہو جائے کہ سامنا کیسا تھا تو آج ہی وہ اسے تڑوا کر پھر سے بنوانا شروع کر دیں گے۔"

پھر وہ ذرا رکا، تھوڑا چونکا، کچھ دیر تک دوسرے آدمی کو ٹٹولنے والی نظروں سے دیکھتا رہا، پھر بولا:

"تو تمھیں پتا ہے حویلی کا سامنا کیسا تھا؟"

"مجھے پتا نہ ہو گا؟" دوسرے آدمی نے دھیرے سے کہا اور محمد میاں اچانک افسردہ نظر آنے لگا۔

"سچ کہا۔ خیر چھوڑو۔ یہ بتاؤ کہیں رہنے کا ٹھکانا ہوا؟ میری مانو تو..." وہ ٹھٹھک کے رہ گیا اور سرگوشی میں بولا "منظور صاحب!"

حویلی کا مالک چائے خانے کے پہلے زینے پر کھڑا ہوا تھا۔

"محمد میاں"، اس نے پھاٹک کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا، "آپ کا انتظار کر رہا ہوں۔"

محمد میاں بوکھلایا ہوا تھا۔ مشکل سے بولا:

"حاضر... حضور حاضر ہوتا ہوں۔ بس کرتا پہن لوں۔"

"آیئے۔ بس شروع ہے"۔ اور وہ پھاٹک کی طرف لوٹ گیا۔

"دیکھا نواب، میں نہ کہتا تھا؟" محمد میاں نے دوسرے آدمی کو مخاطب کیا، "ہیرا آدمی ہے، ہیرا!"

دوسرا آدمی چاندی کے چھلّے کو اپنی انگلی میں آہستہ آہستہ گھماتے ہوئے بولا:
"تم ہو آؤ، محمّد میاں۔ یہاں میں دیکھ لوں گا۔"
"آرام سے بیٹھ جاؤ۔" محمّد میاں کھونٹی پر سے کرتا اتارتے ہوئے بولا، "اس وقت کوئی گاہک تو ادھر آنے سے رہا۔"
دکان کے زینے اترتے اترتے محمّد میاں کرتے کے سب بٹن لگا چکا تھا۔

(۵)

پھاٹک کے آس پاس اب تیز روشنی پھیلی ہوئی تھی۔ خود پھاٹک بھی بجلی کی قندیلوں سے روشن تھا اور ملازم قسم کے لوگ اس میں آجا رہے تھے۔ کوئی مہمان نظر نہ آتا تھا۔

حویلی کا مالک پھاٹک سے باہر آیا۔ دو آدمیوں کو کچھ ہدایتیں دینے کے بعد وہ واپس مڑا اور رک گیا۔ ارشاد لپکتا ہوا پھاٹک سے باہر آ رہا تھا۔
"ارشاد صاحب، کدھر؟" اس نے ارشاد کے سامنے آ کر کہا۔
"گھر۔" ارشاد نے ہانپتے ہوئے جواب دیا۔
"خیریت؟"
"منیجر نے دھوکا کیا۔ معلوم نہیں کن لوگوں کے ساتھ مجھے بٹھا دیا۔"
"سب دوست ہیں، آپ اندر چلیے۔"
"نہیں نہیں۔ وہ میری پارٹی کے آدمی نہیں ہیں۔"
"اچھا، نہ ہوں گے۔ آپ دوسری میز پر بیٹھ جائیے گا۔ چلیے، میں آئس کریم لگوانے جا رہا ہوں۔"
"نہیں، منظور صاحب، خطرہ ہے۔ آپ نہیں سمجھتے۔"
"سب سمجھتا ہوں۔ آپ آئیے تو۔"

اس نے ارشاد کا ہاتھ پکڑنے کی کوشش کی لیکن ارشاد اُس سے کترا کر بھاگ کھڑا ہوا۔

چائے خانے کے اندر قریب قریب اندھیرا تھا۔ ارشاد اس کے تیسرے زینے پر گھٹنوں کے بل گرا۔ کچھ دیر یوں ہی بیٹھا رہا، پھر آہستہ سے کراہ کر اٹھا اور چائے خانے کے دَر میں داخل ہو گیا۔ وہ اب پہلے سے زیادہ ہانپ رہا تھا۔

"محمد میاں!" اُس نے آہستہ سے پکارا، لنگڑاتا ہوا دو تین قدم آگے بڑھا اور کسی سے ٹکرا گیا۔ تھوڑا پیچھے ہٹا۔ پھر اس نے سَر اوپر اٹھایا اور خود کو ایک بڑے سے سیاہ ہیولے کے روبرو پایا۔ ہیولے میں ہلکی سی حرکت ہوئی اور ارشاد نے اُس کے اٹھتے ہوئے ہاتھ کو خوف زدہ ہو کر دیکھا۔ ہاتھ ٹھیک سے نظر نہیں آتا تھا، اس کی انگلی میں پڑا ہوا چاندی کا چھلا البتہ چمک رہا تھا۔

"کون؟" ارشاد نے تھرتھراتی ہوئی آواز میں پوچھا، پھر اس کی گھگھی بندھ گئی۔

"ارشاد میاں"، بھاری مگر نرم آواز آئی، "آپ کا خط مجھے مل گیا۔"

"خط؟"

ہلکی سی پھڑپھڑاہٹ ہوئی اور سیاہ ہاتھ میں دو سفید ورق نظر آئے۔ ارشاد دیر تک اُن کاغذوں کو گھورتا رہا، پھر بڑبڑایا:

"خط... پکڑ گیا!" اچانک وہ زور زور سے بولنے لگا، "میں کچھ نہیں جانتا۔ میں نے کسی کو خط نہیں لکھا۔ مجھے لکھنا ہی نہیں آتا۔"

"آپ کا خط مجھے مل گیا۔"

اب ارشاد کانپ رہا تھا، لیکن اس نے مٹھیاں بھینچ کر خود پر قابو پایا۔
"مجھے جانے دو" وہ قدرے رعب دار لہجے میں بولا۔
ہیولا خاموش رہا۔ ارشاد نے خود پر اور قابو پایا اور کرخت آواز بنا کر بولا:
"میں جا رہا ہوں۔"
ہیولا اب بھی خاموش رہا۔ ارشاد ایک قدم پیچھے ہٹا۔ اب وہ روہانسا ہو رہا تھا، لیکن اُس نے پھر خود کو سنبھالا۔
"میں کسی سے نہیں ڈرتا،" اس نے کہا "میری بھی بہت بڑی پارٹی ہے۔"
"میں بھی آپ ہی کی پارٹی کا آدمی ہوں، ارشاد میاں۔"
اچانک ارشاد نے پیچھے کی طرف چھلانگ لگائی، نیچے سڑک پر گرا، اٹھا اور بھاگتا ہوا سڑک پار کرنے لگا۔ ایک سیاہ کار کی تیز روشنی میں اس کا سراپا چمکا۔ بریک کی چیخ سنائی دی اور اس خالی سڑک پر دیکھتے دیکھتے کئی آدمی پیدا ہو گئے۔ کچھ دیر تک ملی جلی آوازوں کا شور سا رہا جس میں کئی بار ارشاد کا نام سنائی دیا۔ پھر کسی نے کہا:
"اسپتال لے جایئے، اسپتال۔"
ایک اور آواز آئی:
"لیاقت، تم ساتھ بیٹھ جاؤ۔ ہم گھر پر اطلاع کرتے ہیں۔"
زور سے دروازہ بند ہونے کی آواز آئی اور کار جدھر سے آ رہی تھی گھوم کر اُسی سمت روانہ ہو گئی۔

گھومتی ہوئی کار کی روشنی چند لمحے کو چائے خانے کے در میں کھڑے ہوئے آدمی پر پڑی تھی۔ کار کے غائب ہو جانے کے بعد بھی وہ خالی سڑک کی طرف

منہ کیے دیر تک ایک سیاہ مجسمے کی طرح در میں کھڑا رہا۔ پھر آہستہ آہستہ پیچھے ہٹنے لگا۔

اس وقت کوئی گاہک اگر سڑک پر سے دیکھتا تو اسے چائے خانہ خالی نظر آتا۔

# وقفہ

Then did I know how existence could be cherished,
Strengthened, and fed without the aid of joy.

EMILY BRONTË

گذاشتیم و گذشتیم و بودنی همه بود
شدیم و شد سخنِ ما فسانۂ اطفال
(کسائی مروزی)

# وقفہ

یہ نشان ہمارے خاندان میں پشتوں سے ہے، بلکہ جہاں سے ہمارے خاندان کی تاریخ کا سُراغ ملتا ہے وہیں سے اس کا ہمارے خاندان میں موجود ہونا بھی ثابت ہوتا ہے۔ اِس طرح نشان کی تاریخ ہمارے خاندان کی تاریخ کے ساتھ ساتھ چلتی ہے۔

ہمارے خاندان کی تاریخ بہت مربوط اور قریب قریب مکمل ہے، اس لیے کہ میرے اجداد کو اپنے حالات محفوظ کرنے اور اپنا شجرہ درست رکھنے کا بڑا شوق رہا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ہمارے خاندان کی تاریخ شروع ہونے کے وقت سے لے کر آج تک اس کا تسلسل ٹوٹا نہیں ہے۔ البتہ اس تاریخ میں کوئی کوئی وقفہ ایسا آتا ہے۔ . . .

(۱)

میرا باپ اَن پڑھ آدمی تھا اور معمولی پیشے کیا کرتا تھا۔ اُسے کئی ہنر آتے تھے۔ بچپن میں تو مجھے یقین تھا کہ اسے ہر ہنر آتا ہے، لیکن اس کا اصل ہنر معماری کا تھا اور یہی اس کا اصل پیشہ بھی تھا۔ البتہ اگر موسم کی خرابی یا کسی اور وجہ سے اس کو معماری

کا کام نہ ملتا تو وہ لکڑی پر نقاشی یا کوئی اور کام کرنے لگتا تھا۔

میری پرورش اس کے زانوؤں پر ہوئی اور میں نے آنکھ کھولنے کے بعد مدتوں تک صرف اسی کا چہرہ دیکھا۔ مجھے اپنی ماں یاد نہیں، حالاں کہ مجھے اس وقت تک کی بعض باتیں یاد ہیں جب میں دودھ پیتا بچہ تھا۔ اس وقت میں روتا بہت تھا لیکن میرا باپ مجھے بہلانے کی کوشش کرنے کے بجائے مجھ کو اپنے زانو پر لٹائے خاموشی کے ساتھ میرا چہرہ دیکھتا رہتا یہاں تک کہ میں اس کا چہرہ دیکھتے دیکھتے آپ ہی آپ چپ ہو جاتا۔ ظاہر ہے میری پرورش تنہا اس نے نہ کی ہو گی، اس لیے کہ اسے کام پر بھی جانا ہوتا تھا، لیکن اس زمانے کی یادوں میں، جن کا کوئی سر پیر سا بھی نہیں، اپنے باپ کے سوا کسی اور چہرے کا نقش میرے ذہن میں محفوظ نہیں اور وہ بھی صرف اتنا کہ ایک دہرے دالان میں وہ گردن جھکائے چپ چاپ مجھے دیکھ رہا ہے اور مجھ کو اس کے چہرے کے ساتھ اونچی چھت نظر آ رہی ہے جس کی کڑیوں میں سرخ اور سبز کاغذ کی کچی پکی سجاوٹ جھول رہی ہے۔

جب میں نے کچھ ہوش سنبھالا تو مجھ کو احساس ہونے لگا کہ میرا باپ دیر دیر تک گھر سے غائب رہتا ہے۔ یہ اس کا ایسا معمول تھا کہ جلد ہی مجھ کو گھر سے اس کے جانے اور واپس آنے کے وقتوں کا اندازہ ہو گیا۔ میں ان دونوں وقتوں پر، بلکہ ان سے کچھ پہلے ہی، ایک ہنگامہ کھڑا کر دیتا تھا۔ اس کے جاتے وقت میں صحن میں جمع ملبے کے ڈھیر میں سے اینٹوں کے ٹکڑے اٹھا اٹھا کر اسے مارتا رہتا یہاں تک کہ پڑوس کی کوئی خستہ حال بڑھیا آ کر مجھے گود میں اٹھا لیتی۔ ایسی عورتیں میرے مکان کے آس پاس بہت تھیں۔ جتنی دیر میرا باپ گھر سے باہر رہتا ان میں سے ایک دو عورتیں میرے پاس موجود رہتیں۔ کبھی کبھی ان کے ساتھ میلے کچیلے بچے بھی ہوتے تھے۔ باپ کے جانے کے بعد میرا غصہ کم ہو جاتا اور میں کھیل

سے کہانیاں سننے یا بچوں کے ساتھ کھیلنے میں لگ جاتا، لیکن اس کی واپسی کا وقت قریب آتا تو میرا مزاج پھر بگڑنے لگتا تھا۔ اور جیسے ہی وہ گھر کے صحن میں قدم رکھتا میں لپک کر اس کی طرف جاتا اور اپنے چھوٹے چھوٹے کم زور ہاتھوں سے اُسے مارنا شروع کر دیتا۔ اس وقت میرا باپ مجھ سے بھی زیادہ ہنگامہ کرتا اور اس طرح چیختا اور تڑپتا تھا گویا میں نے اس کی ہڈیاں توڑ پھوڑ کر رکھ دی ہیں۔ آخر میرا غصہ کم ہو جاتا اور میں اس کا علاج شروع کرتا۔ وہ تُتلا تُتلا کر مجھے ہدایتیں دیتا جن کے مطابق میں اس کے بدن کو کہیں دباتا، کہیں سہلاتا اور کہیں پر پھونکتا، اس کے فرضی زخموں سے بہتا ہوا فرضی خون پونچھتا اور خیالی شیشیوں میں سے خیالی دوائیں اُس کے منھ میں انڈیلتا جن کی کڑواہٹ ظاہر کرنے کے لیے وہ ایسے بُرے بُرے منھ بناتا کہ مجھے ہنسی آجاتی تھی۔

اس وقت تک، بلکہ اُس کے آخری وقت تک، مجھے علم نہیں تھا کہ وہ میرا حقیقی باپ ہے۔ میں سمجھتا تھا کہ وہ میرے خاندان کا کوئی پرانا ملازم ہے جس نے وفاداری کے ساتھ میری پرورش کی ہے۔ اس غلط فہمی کی ذمّہ داری مجھ سے زیادہ خود اُس پر تھی۔ اس کا برتاؤ میرے ساتھ واقعی ایسا تھا جیسے میں اس کا آقا زادہ ہوں۔ اس لیے میرا برتاؤ اس کے ساتھ برا تھا، لیکن میں اپنے وحشیانہ انداز میں اس سے محبت بھی کرتا تھا جس کی وجہ سے اس کا بدن خراشوں سے کبھی خالی نہ رہتا تھا۔

جب میں کچھ اور بڑا ہوا تو اس کا گھر سے نکلنا مجھے اور زیادہ ناگوار گزرنے لگا۔ اب میں کبھی اس کے اوزاروں کا تھیلا چھپا دیتا، کبھی اس میں سے کچھ اوزار نکال کر ان کی جگہ اینٹوں یا لکڑی کے ٹکڑے رکھ دیتا، یہاں تک کہ اس نے تھیلا ایک اونچے مچان پر رکھنا شروع کر دیا، اور جب میں اس مچان تک بھی پہنچنے لگا تو ایک دن تھیلا

غائب ہوگیا۔ اس کے بعد کئی دن تک میرا باپ گھر سے باہر نہیں نکلا اور دہرے دالان کی سرخ سبز سجاوٹ والی چھت کے نیچے بیٹھا لکڑی پر نقاشی کرتا رہا۔ اس میں اس کا انہماک ایسا تھا کہ میں اس کے کام میں مخل ہوتے ڈر رہا تھا۔ لیکن اس سے زیادہ مجھے اس بات کا ڈر تھا کہ جلد ہی وہ نقاشی کا کام چھوڑ دے گا اور پھر معماری کے اوزاروں کا تھیلا نکال کر گھر سے باہر جانا شروع کر دے گا۔ اس لیے میں اس فکر میں لگ گیا کہ تھیلا تلاش کر کے اسے ہمیشہ کے لیے غائب کر دوں۔ اپنے باپ کو بتائے بغیر کہ مجھے کس شے کی تلاش ہے، میں تھیلے کو مکان کے ایک ایک حصّے میں ڈھونڈھتا پھرا۔ مکان کے اندرونی دالانوں میں زیادہ تر دروازے مقفّل تھے اور مجھے پتا نہیں تھا کہ ان کے پیچھے کیا ہے۔ پرانی وضع کے زنگ آلود قفلوں کو دیکھ کر گمان ہوتا تھا کہ انھیں مدّت سے کھولا نہیں گیا ہے بلکہ ان کی کنجیاں بھی کب غائب ہو چکی ہوں گی۔ اس لیے میں نے فیصلہ کر لیا کہ تھیلا ان دروازوں کے پیچھے نہیں ہے۔ لیکن مکان میں ایسے دروازے بھی بہت تھے جو مقفّل نہیں تھے۔ ان کے پیچھے مجھے خالی کمرے اور کوٹھریاں نظر آئیں۔ صاف معلوم ہوتا تھا کہ ان میں کا سامان ہٹا کر حال ہی میں ان کی مرمّت کی گئی ہے۔ بعض بعض کے فرش پر تو ابھی پانی تک موجود تھا۔ مجھے تعجب ہوا کہ میرا باپ گھر پر بھی کسی وقت معماری کا کام کرتا ہے۔ یہی تعجب کرتا ہوا میں مکان کی مغربی دیوار کے قریب ایک بڑے دروازے کے پاس پہنچ گیا۔ اس دروازے کے دونوں پٹوں پر لکڑی کی دو مچھلیاں ابھری ہوئی تھیں۔ مجھے نہیں معلوم تھا کہ میرے مکان میں کوئی ایسا دروازہ بھی ہے۔ میں دیر تک اس پر ہاتھ رکھے سوچتا رہا کہ اس کے پیچھے کیا ہوگا۔ مجھ کو یقین تھا کہ یہ کسی خالی کمرے کا دروازہ نہیں ہے۔ مزید یقین کے لیے میں نے اسے تھوڑا سا کھول کر اندر جھانکا۔

اوّل اوّل مجھ کو صرف لکڑی کے لمبے لمبے مچان نظر آئے۔ پھر میں نے دیکھا کہ

ان مچانوں پر بہت بڑی بڑی کتابیں ترتیب کے ساتھ سجی ہوئی ہیں۔ میں نے ابھی پڑھنا شروع نہیں کیا تھا تاہم مجھے ان کتابوں میں کچھ دلچسپی سی پیدا ہوئی اور انھیں قریب سے دیکھنے کے لیے میں دروازے سے اندر داخل ہو گیا۔ میں نے دیکھا کہ سامنے والی دیوار کے قریب فرش پر بھی کتابیں ڈھیر ہیں۔ انھیں دیکھنے کے لیے میں آگے بڑھا اور کتابوں کی طرف سے میری توجہ ہٹ گئی۔ ڈھیر کے دوسری طرف دیوار سے ملی ہوئی چٹائی پر ایک بوڑھا آدمی آنکھیں بند کیے چت پڑا ہوا تھا۔ پرانے کاغذوں کی خوشبو کے بیچ میں وہ خود بھی ایک بوسیدہ کتاب معلوم ہو رہا تھا۔

میں ایک قدم پیچھے ہٹا۔ دور پر میرے باپ کی ہتھوڑی کی ہلکی ہلکی آواز سنائی دے رہی تھی اور میں چٹائی پر پڑے ہوئے آدمی کو غور سے دیکھ رہا تھا۔ اپنے بالوں اور لباس سے وہ مجھے کچھ فقیر سا معلوم ہوا۔ اُسے اور غور سے دیکھنے کے لیے میں گھٹنوں پر ہاتھ رکھ کر جھکا ہی تھا کہ اُس نے آنکھیں کھول دیں، کچھ دیر تک چپ چاپ مجھ کو تکتا رہا، پھر اُس کے ہونٹ ہلے۔

"آؤ شہزادے"، اُس نے کہا "سبق شروع کیا جائے؟"

پاگل! میں نے سوچا اور بھاگ کر اپنے باپ کے پاس آگیا۔ وہ اسی طرح اپنے کام میں منہمک تھا۔ اس کے بائیں ہاتھ کی انگلیوں میں چاندی کا تار لپٹا ہوا تھا اور داہنے ہاتھ میں ایک نازک سی ہتھوڑی تھی۔ لکڑی کی ایک ہشت پہل تھالی اس کے سامنے تھی جس پر اُس نے طرح طرح سے مڑی ہوئی پتیاں ابھاری تھیں اور اب ان پتیوں کی باریک رگوں میں چاندی کا تار بٹھا رہا تھا۔ مجھے اپنے قریب محسوس کر کے اس نے گردن اٹھائی اور آہستہ سے مسکرایا۔

"آیئے"، وہ دھیرے سے بولا "کہاں گھوم رہے تھے آپ؟"

"وہاں ... وہ بڈھا کون ہے؟" میں نے پوچھا۔

"تو آپ نے اپنے استاد کو ڈھونڈھ نکالا" وہ بولا اور پھر پتیوں کی رگوں میں تار بٹھانے لگا۔

"استاد؟" میں نے پوچھا۔

"لیکن آپ ڈھونڈھ کیا رہے تھے؟" جواب میں اس نے بھی پوچھا اور مجھے یاد آ گیا۔

"تھیلا..." میں نے کہا، "ازاردل کا تھیلا کہاں ہے؟"

"وہ آپ کو نہیں ملے گا۔"

اب مجھے غصہ آنے لگا۔

"کہاں ہے؟" میں نے پھر پوچھا۔

"نہیں ملے گا۔"

مجھے اور غصہ آیا، لیکن اسی وقت اس نے پوچھا:

"آج کون دن ہے؟"

میں نے اسی غصے میں بتا دیا اور پھر پوچھا:

"تھیلا کہاں ہے؟"

"پرسوں سے آپ کا سبق شروع ہوگا" اس نے بڑے سکون کے ساتھ کہا۔

میں نے اسے برا بھلا کہنے کے لیے منھ کھولا ہی تھا کہ اس نے دونوں ہاتھ آگے بڑھا کر مجھے اپنے قریب کھینچ لیا۔ دیر تک وہ میرا چہرہ دیکھتا رہا۔ اس کی آنکھوں میں امید اور افسردگی کی ایسی آمیزش تھی کہ میں اپنا سارا غصہ بھول گیا۔ اس کی مضبوط انگلیاں میری کلائی اور شانے میں گڑی جا رہی تھیں اور بدن دھیرے دھیرے لرز رہا تھا۔ اس حالت میں وہ مجھے بہت بہت اچھا معلوم ہو رہا تھا۔

"چھوڑ، بڈھے!" میں نے ہنستے ہوئے کہا اور لکڑی کی منقش تھالی پر ہلکی سی

ٹھوکر لگائی۔ ایک پتی کی رگ میں بیٹھا ہوا تار کھوٹا کھڑا آیا اور میرے باپ نے جلدی سے مجھے چھوڑ دیا۔ اس کی انگلیوں میں لپٹے ہوئے تار نے میری کلائی پر جال کا نقش بنا دیا تھا۔ میں نے کلائی اس کی آنکھوں کے سامنے کی۔ وہ تار کے نقش کو دیر تک سہلاتا اور پھونکتا رہا، پھر بولا:

"پرسوں سے"، اور پھر بولا، "پرسوں سے"۔

## (۲)

سبق شروع ہونے کا خیال مجھے اچھا نہیں معلوم ہوا تھا اس لیے دوسرے دن میں اپنے باپ سے خفا خفا سا رہا، لیکن شام ہوتے ہوتے مجھے اپنے استاد کے بارے میں تجسس پیدا ہوا اور تیسرے دن میں اپنے باپ کے پیچھے پیچھے قدرے اشتیاق کے ساتھ مچھلیوں والے دروازے میں داخل ہوا۔ استاد چٹائی پر دوزانو بیٹھا ہوا تھا۔ باپ نے مجھے اس کے سامنے بٹھا دیا اور خود فرش پر ڈھیر کتابوں کو اٹھا اٹھا کر مچانوں پر سجانے لگا، یہاں تک کہ فرش پر صرف ایک کتاب پڑی رہ گئی۔

"اسے آپ اٹھایئے، شاباش،" اُس نے مجھ سے کہا۔

مجھے یہ سب ایک دل چسپ تماشا معلوم ہو رہا تھا۔ کتاب کا وزن زیادہ تھا تاہم میں نے اسے اٹھا لیا اور باپ کے اشارے پر اسے اُستاد کے سامنے رکھ دیا۔ استاد کتاب پر ہاتھ رکھ کر آہستہ سے مسکرایا اور مجھے حیرت ہوئی کہ پرسوں وہ مجھ کو فقیر کیوں معلوم ہوا تھا۔

"اسے کھولو، شہزادے"، اُس نے کہا۔

کتاب کے چند ابتدائی صفحوں کو چھوڑ کر باقی ورق سادہ تھے۔ اُس دن پہلے سادہ ورق پر استاد نے میرا ہاتھ پکڑ کر مجھ سے کچھ لکھوایا۔ اتنی بڑی سی کتاب پر اپنے ہاتھ کی تحریر مجھے بہت اچھی معلوم ہوئی۔ میں چاہتا تھا کہ اُستاد مجھ سے کچھ اور

لکھوائے لیکن میرے باپ نے دونوں ہاتھ آگے بڑھا کر مجھے اپنے قریب کھینچ لیا۔ اس کا بدن دھیرے دھیرے لرز رہا تھا۔ اسی حالت میں دیر تک وہ استاد سے چپکے چپکے باتیں کرتا رہا لیکن وہ دونوں معلوم نہیں کن اشاروں میں گفتگو کر رہے تھے کہ میری سمجھ میں ان کی ایک بات بھی نہیں آئی اور میں اپنے باپ کے ہاتھوں کے حلقے میں گھرا ہوا پیچانوں پر سجی بڑی بڑی کتابوں پر نظریں دوڑاتا رہا۔ آخر میرا باپ مجھے لے کر باہر آ گیا۔

اس کے بعد سے میرا زیادہ وقت استاد کے ساتھ گزرنے لگا اور میں اپنے باپ کو بھول سا گیا، یہاں تک کہ کچھ دن تک مجھے یہ بھی احساس نہیں ہوا کہ اس نے پھر سے اوزاروں کا تھیلا لے کر کام پر جانا شروع کر دیا ہے۔ مچھلیوں والے دروازے کے پیچھے موٹی کتابوں میں گھرا ہوا استاد مجھے ہر وقت موجود ملتا تھا۔ وہ شاید وہیں رہتا تھا۔ میں اکثر اسے دیکھتا کہ فرش پر ڈھیر کتابوں کے پاس آنکھیں بند کیے چت پڑا ہے اور فقیر معلوم ہو رہا ہے۔ میری آہٹ سن کر وہ آنکھیں کھولتا اور ہمیشہ ایک ہی بات کہتا:

"آؤ شہزادے، سبق شروع کیا جائے۔"

لیکن اس نے مجھے پڑھایا کچھ نہیں۔ البتہ لکھنا بہت جلدی سکھا دیا۔ ہر روز لکھنے کی باقاعدہ مشق کرانے کے بعد مجھے اپنے سامنے بٹھا کر وہ بولنا شروع کرتا۔ کسی کسی دن وہ پرانے وقتوں اور دور دراز کے علاقوں کی دلچسپ باتیں بتاتا لیکن زیادہ تر وہ میرے اپنے شہر کے بارے میں باتیں کرتا تھا۔ وہ شہر کے مختلف محلوں میں بسنے والے خاندانوں کا حال سناتا تھا کہ کس محلے کا کون خاندان کس طرح آگے بڑھا اور کیوں کر تباہ ہوا اور اب اس خاندان میں کون کون لوگ باقی ہیں

اور کس حال میں ہیں۔ یہ دل چسپ قصّے تھے لیکن استاد انھیں بے دلی سے بیان کرتا تھا اس لیے وہ مجھے محض بے ربط ٹکڑوں کی طرح یاد رہ جاتے تھے۔ البتہ شہر کے محلّوں کا ذکر وہ اس انداز سے کرتا تھا کہ ہر محلہ مجھے ایک زندہ انسان نظر آتا تھا جس کا مزاج اور کردار ہی نہیں، صورت شکل بھی دوسرے محلّوں سے مختلف ہوتی تھی۔ جوش میں آکر استاد یہ دعویٰ بھی کرنے لگتا تھا کہ وہ شہر کے کسی بھی آدمی کو دیکھتے ہی بتا سکتا ہے کہ وہ کس محلّے کا رہنے والا ہے یا کن کن محلّوں میں رہ چکا ہے۔ اس وقت میں اُس کے اِس دعوے پر ہنستا تھا لیکن اب دیکھتا ہوں کہ خود مجھ میں یہ صفت کچھ کچھ موجود ہے۔

کبھی کبھی اُستاد باتیں کرتے کرتے چٹائی پر چیت لیٹ کر آنکھیں بند کر لیتا تو میں فرش پر ڈھیر کتابوں کے ورق الٹنے پلٹنے لگتا تھا۔ انھیں ورق گردانیوں میں مجھے معلوم ہوا کہ میں پڑھ بھی سکتا ہوں لیکن ہاتھ کی لکھی ہوئی وہ بھاری بھاری کتابیں میری سمجھ میں نہیں آئیں۔ ان میں بعض تو میری اپنی زبان ہی میں نہیں تھیں، بعض کی عبارتیں اور بعض کی تحریریں اتنی گنجلک تھیں کہ بہت غور کرنے پر بھی ان کا بالکل دھندلا سا مفہوم میرے ذہن میں آتا اور فوراً نکل جاتا تھا۔ ایسے موقعوں پر مجھے اپنے اُستاد پر غصّہ آنے لگتا اور کئی مرتبہ میں نے اس سے بڑی بدتمیزی کے ساتھ بات کی۔ ایک بار وہ آنکھیں بند کیے چپ چاپ پڑا میری باتیں سن رہا تھا کہ اچانک میرے سر کے اندر چمک سی ہوئی۔

"بہرا ہو گیا ہے، فقیر؟" میں نے چلّا کر کہا اور ایک بھاری کتاب اٹھا کر اس کے سینے پر پھینک دی۔

اس کے دوسرے دن مجھے اپنے مکان کے قریب کی ایک چھوٹی سی درس گاہ میں پہنچا دیا گیا۔

اس کے بعد میں شہر کی مختلف درس گاہوں میں پڑھتا رہا۔ شروع شروع میں میرا باپ بڑی پابندی کے ساتھ مجھ کو درس گاہ تک پہنچاتا اور وہاں سے واپس لاتا تھا۔ چھٹی ہونے پر میں باہر نکلتا تو دیکھتا کہ وہ درس گاہ کے پھاٹک سے کچھ فاصلے پر کسی درخت کے تنے سے ٹیک لگائے خاموش کھڑا ہے۔ مجھے دیکھ کر وہ آگے بڑھتا، میری کتابیں سنبھالتا، اور کبھی کبھی مجھ کو بھی گود میں اٹھانے کی کوشش کرتا لیکن میں اسے نوچ کھسوٹ کر الگ ہو جاتا تھا۔ کسی کسی دن اسے آنے میں دیر ہو جاتی تو میں سیر کرتا ہوا تنہا گھر لوٹتا اور دوسرے دن اکیلے جانے کی ضد کرتا۔ آخر رفتہ رفتہ میں نے مستقل تنہا جانا اور تنہا واپس آنا شروع کر دیا۔ پھر میں خالی وقت اور چھٹی کے دنوں میں بھی گھر سے باہر نکلنے لگا اور اسی زمانے میں اچھی بری صحبتوں سے بھی آشنا ہوا۔ میں نے شہر کے ان تمام محلوں کے چکر لگائے جن کے بارے میں استاد بتاتا تھا کہ کون ریاکار ہے، کون بزدل، کون چاپلوس اور کون فسادی۔ انھیں گردشوں کے دوران ایک دن میں نے اپنے باپ کو بازار میں دیکھا۔

وہ بازار کے اُس حصے میں کھڑا ہوا تھا جہاں ہر روز صبح کے وقت مزدور اور کاریگر کام کی تلاش میں آکر جمع ہوتے تھے۔ اوزاروں کا تھیلا زمین پر اپنی دونوں ٹانگوں کے بیچ میں رکھے وہ آس پاس کے لوگوں سے آہستہ آہستہ باتیں کر رہا تھا کہ اُس کی نظر مجھ پر پڑ گئی۔ تھیلا زمین پر چھوڑ کر وہ لپکتا ہوا میری طرف آیا۔

"کیا ہوا؟" اس نے پوچھا۔

"کچھ نہیں،" میں نے جواب دیا۔

وہ کچھ دیر تک مجھ کو سوالیہ نظروں سے دیکھتا رہا، پھر بولا؛

"کوئی بات ہو گئی ہے؟"

"کچھ نہیں،" میں نے پھر کہا

"ہمیں دیکھنے آئے تھے؟" اس نے پوچھا، پھر خود ہی بولا، "ایسا ہے تو ہمیں کام پر دیکھیے۔" پھر وہ آہستہ سے ہنسا۔

اسی وقت کسی مزدور نے اس کا نام لے کر پکارا اور وہ اپنے تھیلے کی طرف لوٹ گیا جہاں ادھیڑ عمر کا ایک شخص اس کے انتظار میں کھڑا تھا۔ اس نے میرے باپ سے کچھ پوچھا، پھر دیر تک اسے کچھ سمجھاتا رہا۔ وہ بار بار اپنے ہاتھوں سے ہوا میں محراب یا گنبد کی سی شکل بناتا تھا۔ اس کی انگلیوں میں بڑے بڑے نگینوں والی کئی انگوٹھیاں تھیں جنھیں وہ جلدی جلدی انگوٹھے سے گھماتا تھا۔ بہت سی آوازوں کے بیچ میں اس کی اونچی کھرکھراتی ہوئی آواز صاف سنائی دے رہی تھی مگر یہ سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ وہ کیا کہہ رہا ہے۔ کچھ دیر بعد میرے باپ نے اوزاروں کا تھیلا اٹھایا اور اس شخص کے پیچھے پیچھے چل دیا۔ مجھے خیال آیا کہ اس کے تھیلے میں کسی اوزار کی جگہ میرا رکھا ہوا اینٹ یا لکڑی کا ٹکڑا نہیں ہوگا، لیکن اس خیال سے مجھے خوشی کے بجائے کچھ افسردگی سی محسوس ہوئی۔ اس افسردگی پر مجھ کو تعجب بھی ہوا۔ میں سیدھا گھر واپس آ گیا اور اگرچہ وہ پورا دن میں نے استاد کے ساتھ فضول بحثوں میں گزارا لیکن تمام وقت مجھے گھر میں باپ کی کمی محسوس ہوتی رہی۔ یہ خیال بھی مجھ کو بار بار آیا کہ میں نے ابھی تک اسے معماری کا کام کرتے نہیں دیکھا ہے۔ یہ مجھے اپنی بہت بڑی کوتاہی معلوم ہوئی لیکن اس کی تلافی کا خیال مجھے نہیں آیا۔

ایک دن سہ پہر کے قریب گھومتا پھرتا میں اپنی ایک پرانی درس گاہ کے سامنے پہنچ گیا۔ یہ درس گاہ مدتوں پہلے ایک تاریخی عمارت میں قائم کی گئی تھی اور اب بھی اسی عمارت میں تھی۔ عمارت بوسیدہ ہو چکی تھی اور جب میں وہاں پڑھتا تھا تو اس کی

ایک جیبت بیٹھ گئی تھی جس کے بعد میرے باپ نے مجھے اس درس گاہ سے اٹھالیا تھا اس لیے کہ کچھ دیر پہلے تک میں اسی چھت کے نیچے تھا۔ اتنے دن بعد اِدھر آیا تو میں نے دیکھا کہ درس گاہ کی ٹوٹی ہوئی چار دیواری درست کر دی گئی ہے۔ لکڑی کا وہ بیرونی پھاٹک غائب تھا جس کے پٹوں میں لوہے کے پھول جڑے ہوئے تھے اور بائیں پٹ میں نیچے کی طرف چھوٹا سا ایک پٹ کا دروازہ تھا۔ اب اس پھاٹک کی جگہ لوہے کا کٹہرے دار پھاٹک تھا جس کے پیچھے اصل عمارت میں داخلے والی اونچی محراب نظر آ رہی تھی۔ محراب کے اس طرف لوگ چل پھر رہے تھے، حالاں کہ وہ چھٹی کا دن تھا۔ یہ سوچ کر کہ شاید ان لوگوں میں کوئی جان پہچان والا مل جائے، میں پھاٹک سے گزر کر محراب کی طرف بڑھا۔ قریب پہنچ کر میں نے دیکھا کہ محراب کی پیشانی پر بالکل ویسی ہی دو مچھلیاں ابھری ہوئی ہیں جیسی میرے مکان میں استاد والے کمرے کے دروازے پر تھیں۔ مجھ کو حیرت ہوئی کہ اس درس گاہ میں اتنے دن آنے جانے کے باوجود ان مچھلیوں پر کبھی میری نظر نہیں پڑی۔ اب میں نے انھیں غور سے دیکھا۔ محراب کی شکستہ پیشانی کی مرمت کی جا چکی تھی۔ مچھلیاں کہیں جگہ جگہ سے ٹوٹی ہوئی تھیں۔ داہنی طرف والی مچھلی کی دُم غائب تھی۔ اس کی جگہ نیا نارنجی مسالا بھر دیا گیا تھا اور میرا باپ دو آڑی بلّیوں پر ٹکا ہوا اس مسالے کو مچھلی کی دُم کی شکل میں تراش رہا تھا۔ وہ سر پر ایک کپڑا لپیٹے ہوئے تھا جس کی وجہ سے میں اس کو پہچان نہیں سکا۔ میں نے اُسے اس کے تھیلے سے پہچانا جو محراب کے داہنے پائے سے لگا ہوا رکھا تھا اور اس میں سے کچھ اوزار باہر جھانک رہے تھے۔ دیر تک اُسے اپنے کام میں کھویا ہوا دیکھتے رہنے کے بعد میں نے زمین پر سے پرانے ٹوٹے ہوئے مسالے کا ایک ٹکڑا اُٹھا کر اُس کی طرف اُچھالا۔ ٹکڑا اس کے پیر کے پاس بلّی سے ٹکرا کر واپس گرا اور اُس نے نیچے کی طرف دیکھا، آہستہ سے ہنسا، پھر بولا:

"تو آپ نے ہم کو ڈھونڈھ نکالا؟"

مجھے اس کی آواز شکستہ مچھلی کے کھلے ہوئے منھ سے آتی ہوئی معلوم ہوئی۔ وہ پھر اپنے کام کی طرف متوجہ ہوگیا اور دیر تک کچھ نہیں بولا۔

"کب تک اوپر ٹنگے رہوگے بڈھے؟" آخر میں نے پوچھا۔

"وقت تو ہوگیا" اس نے بتایا، "کام تھوڑا باقی ہے۔ زیادہ دیر نہیں ہے۔"

تھوڑی دیر بعد وہ نیچے اترا۔ اس کے ہاتھ میں چھوٹے اوزار تھے جن میں سے کچھ کو اس نے قریب ہی بنے ہوئے ایک عارضی حوض میں دھویا، سر پر لپٹا ہوا کپڑا کھول کر اس سے اوزاروں کو پونچھا اور میری طرف دیکھ کر تھکے ہوئے انداز میں مسکرایا۔ میں نے اوزار اس سے لے کر تھیلے میں رکھ دیے اور ہم دونوں ساتھ ساتھ کٹہرے دار پھاٹک کی طرف چلے۔ آدھا راستہ طے کر کے وہ رکا، اپنی جگہ پر کھڑے کھڑے گردن موڑ کر کچھ دیر تک اپنے دن بھر کے کام کو دیکھتا رہا، پھر پھاٹک کی طرف بڑھ گیا۔

چوتھے یا پانچویں دن میں نے اسے تھیلا لے کر گھر سے باہر نکلتے دیکھا تو پوچھا:

"آج کہاں کام لگا یا ہے؟"

"وہیں،" اس نے کہا، پھر بولا، "آج بھی دیر میں لوٹنا ہوگا۔"

لیکن اس دن دوپہر سے ذرا پہلے کچھ طالب علموں کے جھگڑے میں محراب سے لگی ہوئی ٹلیاں اس طرح ہلیں کہ میرے باپ کا توازن بگڑ گیا اور وہ مچھلیوں کی اونچائی سے درس گاہ کے سنگی فرش پر آگرا۔

اس وقت میں گھر ہی پر تھا اور استاد سے کسی فضول بات پر بحث کر رہا تھا۔ دو تین مزدور اسے سہارا دے کر لائے۔ انھوں نے اپنی دیہقانی بولی میں حادثے کی مبہم سی تفصیل بتائی اور کام پر واپس چلے گئے۔ اس کے بدن پر کوئی زخم نہیں تھا لیکن اس کی آنکھوں سے معلوم ہوتا تھا کہ وہ کرب میں ہے۔ میں نے اور استاد نے اسے

بستر پر لٹا دیا۔

کئی دن تک میرا باپ چپ چاپ بستر پر پڑا رہا اور میرا اُستاد چپ چاپ اس کے سرھانے بیٹھا رہا۔ پڑوس کی خستہ حال بڑھیاں ان دونوں کی خبر گیری کرتی رہیں۔ میں اس عرصے میں کئی بار گھر سے باہر نکلا لیکن تھوڑی ہی دور جا کر واپس آ گیا۔

ایک دن واپس آتے ہوئے مجھے اس محراب اور اس کی پیشانی کی شکستہ مچھلیوں کا خیال آیا اور میں درس گاہ کی طرف لوٹ گیا۔ وہ بھی چھٹی کا دن تھا۔ میں محراب کے سامنے جا کر کھڑا ہو گیا۔ ایک مچھلی درست ہو چکی تھی۔ اس کی پُشت پر سفنوں کا جال اس طرح تراشا گیا تھا کہ معلوم ہوتا تھا ایک ایک سفنے کو الگ الگ ڈھال کر مچھلی کے بدن میں بٹھایا گیا ہے۔ ہر سفنا بیچ میں ہلکا سا ابھرا ہوا، کناروں پر دھنسا ہوا اور دوسرے سفنوں میں پھنسا ہوا نظر آتا تھا۔ مچھلی کی آنکھ کی جگہ ایک گول سوراخ تھا۔ مجھے ایسا محسوس ہوا کہ مچھلی منھ کھولے ہوئے مجھے گھور رہی ہے۔ میں نے اس پر سے نظر ہٹا لی۔ دوسری مچھلی کا سارا اوپری مسالا توڑ دیا گیا تھا اور اب اس کے نیچے کی پتلی پتلی اینٹیں نیم دائرے کی شکل میں ابھری رہ گئی تھیں، لیکن ان ابھری ہوئی اینٹوں سے بھی ایک مچھلی کا خاکہ بنتا تھا۔ داہنی طرف والی مکمل مچھلی کے مقابل اس خاکے کی وجہ سے محراب کی پیشانی کچھ ٹیڑھی اور کچھ شکن آلود معلوم ہونے لگی تھی۔ بلّیاں اسی طرح لگی ہوئی تھیں۔ میں نے ایک بلّی کو پکڑ کر آہستہ سے ہلایا۔ اس کے اوپری سرے پر آڑی بندھی ہوئی بلّی ہلکی آواز کے ساتھ محراب سے ٹکرائی۔ یہ آواز بھی مجھے مچھلی کے کھلے ہوئے منھ سے آتی محسوس ہوئی۔ پھر یہ آواز ایک انسانی آواز میں بدل گئی جو دہقانی بولی میں میرے باپ کی خیریت دریافت کر رہی تھی۔ اسی وقت میری نظر محراب کے نیچے کھڑے ہوئے ایک شخص پر پڑی۔ یہ انھیں مزدوروں میں سے ایک تھا جو میرے باپ کو گھر لائے تھے۔ میں نے اس کے سوال کا مختصر جواب دیا اور وہ دیر تک میرے باپ

کی کاریگری کی تعریفیں کرتا رہا۔ اس میں اس نے معماری کی کئی ایسی اصطلاحیں استعمال کیں جن سے میں واقف نہیں تھا۔ اس نے شہر کی بعض مشہور تاریخی عمارتوں کے نام لیے جن کی مرمت اور درستی میں اس نے میرے باپ کے ساتھ کام کیا تھا۔ اس نے اپنا نام بھی بتایا اور تاکید کی کہ میں اپنے باپ کو بتا دوں کہ اس نام کا مزدور اسے پوچھ رہا تھا، پھر مجھے ٹھہرے رہنے کا اشارہ کر کے وہ قریب کی ایک کوٹھری میں داخل ہوا اور میرے باپ کے اوزاروں کا تھیلا لیے ہوئے باہر آیا۔ تھیلا میرے ہاتھ میں دیتے ہوئے اس نے لمبی سانس کھینچی۔ وہ میرے باپ سے بہت زیادہ عمر کا معلوم ہوتا تھا۔ ایک اور لمبی سانس کھینچ کر وہ کچھ کہنے ہی کو تھا کہ درس گاہ کے اندرونی حصوں سے کسی نے اس کو آواز دی۔ میں نے اسے محراب میں داخل ہوتے اور بائیں طرف مڑتے دیکھا۔ تھیلے کے اوزاروں میں ہلکی سی کھڑکھڑاہٹ ہوئی اور اگرچہ میری نظریں زمین پر تھیں لیکن مجھے پھر محسوس ہوا کہ داہنی طرف والی مچھلی منھ کھولے ہوئے اپنی آنکھ کے سوراخ سے میری طرف دیکھ رہی ہے۔ میں نے اوزاروں کو تھیلے میں ٹھیک سے رکھا اور درس گاہ کے کٹہرے دار پھاٹک سے نکل کر سڑک پر آ گیا۔ گھر پہنچ کر تھیلا میں نے استاد والے کمرے میں کتابوں کے ایک ڈھیر پر رکھ دیا اور کمرے سے باہر نکل آیا۔

دوہرے دالان میں بستر پر میرا باپ اسی طرح چپ چاپ پڑا ہوا اور استاد اسی طرح چپ چاپ اس کے سرھانے بیٹھا ہوا تھا۔

(۳)

درس گاہ میں گرنے کے بعد میرا باپ پھر کام پر نہیں جا سکا بلکہ بستر سے اٹھ بھی نہ سکا۔ کچھ دن تک وہ اس طرح گم سم پڑا رہا کہ خیال ہوتا تھا اسے دماغی چوٹ آئی ہے اور وہ اپنے حواس کھو بیٹھا ہے لیکن ایک بار جب میں نے چاہا کہ اس کا بستر

کتابوں والے کمرے میں کر دوں تو اس کی آنکھوں سے ظاہر ہونے لگا کہ وہ اس دہرے دالان سے ہٹنا نہیں چاہتا جہاں ابھی تک اس نے ہر موسم گزارا تھا۔ آخر رفتہ رفتہ اس نے دھیمی آواز میں بولنا شروع کیا۔ ایک دن اس نے اشارے سے مجھ کو اپنے قریب بلایا اور استاد، جو اُس کے سرھانے بیٹھا ہوا تھا، اٹھ کر کتابوں والے کمرے میں چلا گیا۔

"میرا کام ختم ہو گیا ہے"، وہ مجھے بستر پر بیٹھنے کا اشارہ کرتے ہوئے بولا:
مجھے اس کا گردن موڑ کر اپنے دن بھر کے کام کو دیکھنا یاد آیا اور میں نے اس کے سرھانے بیٹھ کر اس کا سر اپنے زانو پر رکھ لیا۔

"ایک مچھلی ابھی باقی ہے"، میں نے گردن جھکا کر اسے دیکھتے ہوئے کہا۔

وہ کچھ بولے بغیر میری طرف دیکھتا رہا۔ مجھے اس کی آنکھوں میں اپنے چہرے کے ساتھ چھت کی کڑیوں سے جھولتی ہوئی سجاوٹ نظر آئی، یا شاید یہ میرا صرف وہم تھا۔ اسی وقت اس نے اپنا چہرہ موڑ لیا اور بولا:

"مجھے بٹھا دو۔"

کئی تکیوں کے سہارے بیٹھنے کے بعد وہ کسی خیال میں ڈوب گیا۔ اس سے پہلے وہ مجھے سوچنے والا آدمی نہیں معلوم ہوتا تھا لیکن اس وقت کئی تکیوں سے ٹیک لگائے، قاعدے کا صاف ستھرا لباس پہنے، وہ کچھ سوچ رہا تھا۔ اس وقت پہلی بار مجھے خفیف سا شبہ ہوا کہ وہ میرا حقیقی باپ ہے۔

"جب صرف یہ مکان اور تم باقی رہ گئے"، اس نے چھت کی طرف دیکھتے ہوئے کہا، "تو میں نے سوچا اب مجھے کچھ کرنا چاہیے۔"

مجھے یقین تھا کہ وہ اپنی زندگی کی کہانی سنانے والا ہے، لیکن وہ خاموشی کے ساتھ چھت کو گھورتا اور کچھ سوچتا رہا۔ پھر دوسری طرف گردن موڑ کر بولا:

"جاؤ، کہیں گھوم آؤ۔"

"جی نہیں چاہتا"، میں نے کہا۔

اس نے میرا شانہ پکڑ کر آہستہ سے اپنی طرف کھینچا۔ اس کی گرفت کم زور اور ہاتھ میں لرزش تھی۔

"سامان کم رہ گیا تھا"، اس نے تقریباً سرگوشی میں کہا، "میں نے اسے اور کم نہیں ہونے دیا۔ تمھیں وہ بہت معلوم ہو گا۔"

مجھے زنگ آلود قفلوں والے بند دروازے یاد آئے۔ میں نے کہا:

"سامان مجھ کو نہیں چاہیے۔"

"میں نے اس میں کچھ بڑھایا بھی ہے"، اس نے اسی طرح سرگوشی میں کہا۔

"مجھے کچھ نہیں چاہیے۔"

"اسی میں کہیں وہ بھی ہے"، اس نے کہا، "میں نے اسے تلاش نہیں کیا، تم ڈھونڈ ھ لینا۔" پھر کچھ رک کر بولا، "وہ کتابوں میں بھی ہو گا۔"

اسی کے ساتھ اس کی حالت کچھ بگڑ گئی۔ میں دوڑتا ہوا استاد کے کمرے میں گیا۔ وہ مجھے دیکھتے ہی اٹھ کھڑا ہوا اور میں اُسے ہاتھ پکڑ کر گھسیٹتا ہوا باپ کے بستر تک لایا۔ اس نے گردن گھما کر استاد کو دیکھا، پھر مجھے۔ میری طرف دیکھتے دیکھتے اس نے اپنی ناہموار سانسوں پر قابو پایا اور بولا:

"اسے الگ مت کرنا، وہ ہمارا نشان ہے۔"

میں نے استاد کی طرف دیکھ کر اشارے سے پوچھا کہ میرا باپ کس چیز کا ذکر کر رہا ہے، لیکن استاد اس طرح گم سم بیٹھا تھا جیسے نہ کچھ سن رہا ہو، نہ دیکھ رہا ہو، البتہ میرے باپ کی آنکھیں، جن کی چمک ماند پڑ گئی تھی، کچھ دیکھتی معلوم ہو رہی تھیں۔

"وہ کیا چیز ہے؟" میں نے اس پر جھک کر پوچھا۔

"اس کی خاطر خون بہا ہے۔" وہ دھیمی آواز میں بولا اور اس کی مٹھیاں بھنچ گئیں۔ اس کی سانس، جو ہموار ہو چلی تھی، پھر ناہموار ہو گئی۔

استاد اسی طرح گم سم بیٹھا تھا اور میری سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ اس موقع پر مجھے کیا کرنا چاہیے۔ میں نے باپ کے دونوں کندھے پکڑ لیے۔ اب مجھے یقین ہو گیا کہ میں اس کا حقیقی بیٹا ہوں، اور میری سمجھ میں یہ بھی نہیں آ رہا تھا کہ اسے کیا کہہ کر پکاروں، اس لیے میں اس کے کندھے پکڑے خاموشی کے ساتھ اس کے چہرے کے بدلتے ہوئے رنگوں کو دیکھتا رہا۔ کچھ دیر بعد اس کی حالت اپنے آپ سنبھل گئی۔ اس نے بہت صاف آواز اور معتدل لہجے میں کہا:

"جاؤ گھوم آؤ۔"

اس بار میں انکار نہیں کر سکا اور اس کے کندھے چھوڑ کر مکان سے باہر نکل آیا۔

میرا باپ بہت دن زندہ نہیں رہا۔ آخری دنوں میں وہ زیادہ تر خاموش پڑا رہتا تھا، صرف کبھی کبھی دھیرے دھیرے کراہنے لگتا تھا لیکن پوچھنے پر کبھی بتاتا نہیں تھا کہ اسے کیا تکلیف ہے۔ ایک بار جب میں نے بہت اصرار سے پوچھا اور اس کے خاموش رہنے پر خود کو غصے میں ظاہر کیا تو اس نے صرف اتنا بتایا:

"کچھ معلوم نہیں۔"

اس کے دوسرے یا تیسرے دن دوپہر کے وقت میں سو رہا تھا کہ استاد نے مجھے جھنجھوڑ کر جگا دیا۔ آنکھ کھلتے ہی میں نے سمجھ لیا کہ میرا باپ ختم ہو گیا ہے لیکن جب میں دوڑتا ہوا اس کے بستر کے پاس پہنچا تو وہ مجھے زندہ ملا۔ مجھ کو دیکھتے ہی اس نے ایک ہاتھ آگے بڑھایا اور میرا شانہ پکڑ کر جلدی جلدی کچھ کہنے لگا۔ اس کی آواز بہت دھیمی تھی۔ میں ٹھیک سے سننے کے لیے اس کے اوپر جھک گیا، پھر بھی میری

سمجھ میں نہیں آیا کہ وہ کیا کہہ رہا ہے۔ بہت جھک کر سننے پر صرف اتنا سمجھ میں آیا کہ وہ تتلا کر بول رہا ہے۔ اسی وقت وہ بے ہوش ہوگیا، اور اسی بے ہوشی میں کسی وقت اس کا دم نکل گیا۔

باپ کے مرنے کے بعد دیر تک میں بالکل پرسکون رہا۔ میں نے بڑی سنجیدگی کے ساتھ اس کے آخری انتظامات کے متعلق استاد سے صلاح مشورہ کیا اور ہر بات کا خود فیصلہ کیا۔ لیکن جب وہ انتظام شروع ہو گئے تو میرے سر کے اندر کوئی چیز ہلی اور مجھ میں ایک جوش پیدا ہو گیا۔ میں نے اسی جوش میں فیصلہ کر لیا کہ موت میرے باپ کی نہیں، میری ہوئی ہے، پھر یہ فیصلہ کیا کہ باپ بھی میں خود ہی ہوں۔ پھر مجھ کو یہ دونوں فیصلے ایک معلوم ہونے لگے اور میں نے عجب واہیات حرکتیں کیں۔ صحن سے اینٹوں کے ٹکڑے اٹھا اٹھا کر دہرے دالان میں پھینکے اور خود کو مخاطب کر کے تتلانا شروع کر دیا۔ میرے باپ کا مردہ نہلانے کے لیے جو پانی بھرا گیا تھا اس میں سے کچھ اپنے اوپر انڈیل لیا اور باقی میں کوڑا کرکٹ ملا دیا، اس کے بدن پر لپیٹنے کے لیے جو سفید کپڑا منگایا گیا تھا اسے کھول کر خود کو اس میں لپیٹ لیا۔ اور جب اسے لے کر چلنے لگے تو اس میں بھی ایسی رکاوٹیں ڈالیں کہ کئی بار اس کی میت زمین پر گرتے گرتے بچی۔ میں نے اتنا ہنگامہ کیا کہ لوگ اس کے مرنے پر افسوس ظاہر کرنا بھول گئے۔ آخر مجھے زبردستی پکڑ کر واپس لایا گیا اور گھر میں بند کر دیا گیا جہاں روتی ہوئی خستہ حال بڑھیوں کی تسلی آمیز باتیں سن کر مجھے اس قدر غصہ آیا کہ کچھ دیر کے لیے میں اپنے باپ کی موت کو بھول گیا۔ لیکن میں نے ان بڑھیوں پر اپنا غصہ ظاہر نہیں ہونے دیا۔ اور توقع کے بالکل خلاف مجھ کو نیند آ گئی۔

میں دوسرے دن تک سوتا رہا۔ میں نے کئی خواب بھی دیکھے، لیکن ان کا میرے باپ یا اس کی موت سے کوئی تعلق نہیں تھا۔

تین دن تک میں کھویا کھویا سا رہا۔ استاد دن میں کئی بار آتا اور کچھ دیر تک مجھے خاموشی کے ساتھ دیکھتے رہنے کے بعد واپس چلا جاتا۔ چوتھے دن مجھے یاد آیا کہ میرے باپ نے مجھ سے کچھ ڈھونڈھنے کو کہا تھا، اور میں نے بے سمجھے بوجھے گھر بھر میں اسے تلاش کرنا شروع کر دیا۔ اسی تلاش میں پھرتا ہوا میں مچھلیوں والے دروازے میں داخل ہوا اور مچانوں پر سجی ہوئی کتابیں کھینچ کھینچ کر زمین پر گرانے اور پڑھے بغیر اُن کے ورق پلٹنے لگا۔ فرش پر غبار پھیل گیا اور کاغذ خور زرد پہلی مچھلیاں کتابوں کے اندر سے نکل نکل کر زمین پر ادھر ادھر بھاگنے لگیں۔ اسی میں میری نظر چٹائی کے قریب کتابوں کے ڈھیر پر رکھے ہوئے اوزاروں کے تھیلے پر پڑی۔ میں اس کے قریب بیٹھ گیا، دیر تک بیٹھا رہا اور رات ہوئی تو وہیں سو گیا۔

اُس رات میں نے خواب میں اپنے باپ کو دیکھا کہ درس گاہ کی محراب کے آگے کھڑا ہوا گردن موڑ کر اپنی درست کی ہوئی مچھلی کو دیکھ رہا ہے اور مچھلی کی آنکھ چمک رہی ہے اور وہ بھی میرے باپ کو دیکھ رہی ہے۔

دوسرے دن میں نے اوزاروں کا تھیلا اٹھایا، گھر سے نکلا اور بازار میں اپنے باپ کی جگہ پر جا کھڑا ہوا۔ دیر ہو گئی تھی اور سب لوگ وہاں سے جا چکے تھے، پھر بھی میں دیر تک اسی جگہ کھڑا رہا اور کسی نے میری طرف توجہ نہیں کی، یہاں تک کہ میرا استاد مجھے ڈھونڈھتا ہوا وہاں آ پہنچا اور میرا ہاتھ پکڑ کر گھر واپس لے آیا۔ راستے میں جب اس نے مجھ کو سمجھانے بجھانے کی کوشش کی تو میں نے اس کے کپڑے پھاڑ ڈالے۔

کئی روز تک اسی طرح استاد سے میرا جھگڑا چلتا رہا، آخر اس نے میرے

یہاں آنا چھوڑ دیا، لیکن میرا کھانا وہ دونوں وقت پابندی سے بھجواتا رہا۔ میلی کچیلی آوارہ گرد چھوکریاں اور ہلتی ہوئی گردنوں والی بوڑھی عورتیں مکان کا صدر دروازہ کھٹکھٹاتیں اور کھانے کی پوٹلی میرے ہاتھ میں تھما کر چپ چاپ لوٹ جاتیں، مگر ایک دن میں نے دیکھا کہ کھانا لانے والی ایک چھوکری کے پیچھے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھے میرا استاد کھڑا ہے۔ مجھے دیکھ کر وہ آگے بڑھ آیا۔ کچھ دیر تک خاموشی کے ساتھ میری طرف دیکھتا رہا، پھر اپنے سینے کی طرف انگلی سے اشارہ کر کے بولا:

"اب میں ختم ہو رہا ہوں"

اس دن میں نے روشنی میں پہلی بار اسے غور سے دیکھا۔ اس کے چہرے پر جھرّیوں کا جال تھا اور وہ ہمیشہ سے زیادہ فقیر معلوم ہو رہا تھا۔ دیر تک ہم دونوں بغیر کچھ بولے آمنے سامنے کھڑے رہے اور اس کے ساتھ کی چھوکری دونوں ہاتھوں سے اپنا سر کھجاتی رہی۔ الجھے ہوئے بالوں میں اس کے بڑھے ہوئے ناخنوں کی رگڑ سے کھرکھراہٹ کی آواز پیدا ہو رہی تھی جسے سن کر مجھے بہت سی انگوٹھیوں والا وہ شخص یاد آ گیا جو میرے باپ کو بازار سے اپنے ساتھ لے گیا تھا، پھر مجھے باپ کے اوزار لے کر اپنا بازار جانا اور استاد کا مجھ کو واپس لانا یاد آیا۔

"میں نے تمھارے ساتھ اچھا سلوک نہیں کیا،" میں نے آہستہ سے کہا۔

اس نے میری بات یا تو سنی نہیں یا سن کر ان سنی کر دی اور میری طرف اس طرح دیکھتا رہا جیسے مجھ سے کسی بات کی توقع کر رہا ہو۔ اس طرح وہ میری طرف پہلے بھی کبھی کبھی دیکھنے لگتا تھا جس پر مجھے خواہ مخواہ غصہ آ جاتا تھا۔ اس وقت بھی مجھ کو الجھن سی ہوئی اور میں نے اس کے چہرے پر سے نظریں ہٹا لیں۔ میں اس سے کچھ کہنا چاہتا تھا لیکن اس سے پہلے ہی اس نے مڑ کر چھوکری کے کندھے پر ہاتھ رکھا۔

"اب طاہرہ بی بی"، اس نے چھوکری کو بتایا اور اس کے پیچھے دھیرے دھیرے

چلتا ہوا واپس ہو گیا۔

جب وہ دونوں میری نگاہوں سے اوجھل ہو گئے تو مجھے خیال آیا کہ میں نے استاد سے گھر کے اندر چلنے کو نہیں کہا۔

مجھے اس کا گھر نہیں معلوم تھا۔ پڑوس کی بڑھیوں نے محض اندازے سے اس کے الگ الگ پتے بتائے لیکن جب میں ان پتوں پر پہنچا تو وہاں کوئی استاد کا جاننے والا نہ نکلا۔ میں نے اس تلاش میں کئی دن ضائع کیے، البتہ اس طرح ایک بار پھر میں نے قریب قریب پورے شہر کا چکر لگا لیا۔ اس گردش میں اپنے شہر کی تاریخی عمارتوں کو میں نے خاص طور پر دیکھا۔ میں نے ان عمارتوں کے مرمت شدہ حصّوں کا غور سے جائزہ لیا اور ان میں کئی جگہ مجھے اپنے باپ کا ہاتھ نظر آیا۔ ان عمارتوں کے کسی نہ کسی دروازے یا داخلے کے پھاٹک پر مجھے مچھلیاں ضرور بنی ہوئی نظر آئیں۔ شہر کے پرانے گرتے ہوئے مکانوں کے دروازے بھی مچھلیوں سے خالی نہیں تھے اور ہر مچھلی مجھے اپنے باپ کی بنائی ہوئی معلوم ہوتی تھی اور ہر شکستہ مچھلی کو دیکھ کر مجھے اپنی درس گاہ کی محراب پر بنی ہوئی مکمل مچھلی یاد آتی تھی۔

انھیں سیروں میں مجھے یقین ہوا کہ مچھلی میرے شہر کا نشان ہے۔ مجھے ایسا محسوس ہوا کہ میں نے کسی مبہم سے معمے کا حل دریافت کر لیا ہے، لیکن اسی کے ساتھ مجھے یہ بھی محسوس ہونے لگا کہ یہ حل اصل معمے سے بھی زیادہ مبہم ہے۔ اپنے باپ کا خیال مجھ کو بار بار آنے لگا، یہاں تک کہ ایک گم نام تاریخی عمارت کے کھنڈر کی طرف بڑھتے بڑھتے میں پلٹ پڑا۔ گھر پہنچ کر میں نے استاد کے کمرے والی چٹائی اٹھائی اور دوہرے دالان میں اپنے باپ کے آخری بستر کی جگہ پر بچھا دی۔ چٹائی کے عین اوپر چھت کی کڑیوں میں سرخ سبز کاغذ کی سجاوٹ جھول رہی تھی۔ میں نے دیکھا کہ اس دالان کی بھی مرمت ہوئی ہے اور چھت میں جگہ جگہ نیا مسالا بھرا گیا ہے، لیکن چھت کا وہ حصہ جہاں پر یہ سجاوٹ

تھی، بے مرمت رہ گیا تھا اور اس کے پرانے پھولے ہوئے مسالے کو دیکھ کر خیال ہوتا تھا کہ یہ بہت جلد گرنے والا ہے۔ میں نے خواہش کی کہ یہ ابھی گر جائے، اور چٹائی پر لیٹ کر آنکھیں بند کر لیں۔ اسی وقت مکان کے صدر دروازے پر کسی نے دستک دی۔

آخری بار استاد کے ساتھ آنے والی چھوکری دروازے کے سامنے کھڑی تھی۔ وہ ایک ہاتھ سے سر کھجائے جا رہی تھی۔ اس کے دوسرے ہاتھ میں ایک بڑا سا فسلی پھل تھا جس پر وہ ادھر اُدھر دانت لگا رہی تھی۔

"کیا بات ہے؟" میں نے پوچھا۔

وہ کچھ دیر تک پھل پر منھ مارنے کے لیے مناسب جگہ تلاش کرتی رہی، پھر بولی:

"طاہرہ بی بی نے کہلایا ہے، آپ کے استاد نہیں رہے۔"

ایک لمحے کے لیے مجھے وہم ہوا کہ استاد اس کے کندھے پر ہاتھ رکھے کھڑا ہے۔ میں دیر تک چھوکری کی طرف دیکھتا رہا یہاں تک کہ وہ شرمانے لگی۔

"کب؟" آخر میں نے پوچھا۔

"کئی دن ہو گئے۔ ہم تین بار آئے، آپ ملے نہیں۔"

"ان کے گھر میں کون کون ہے؟"

"استاد کے گھر میں؟ کوئی بھی نہیں۔"

"ان کی دیکھ بھال کون کرتا تھا؟"

"طاہرہ بی بی آجاتی تھیں"

"طاہرہ بی بی اُن کی کون ہیں؟"

"پتا نہیں۔"

"وہ رہتی کہاں ہیں؟"

"طاہرہ بی بی؟ پتا نہیں۔"

اس کے بعد وہ واپس جانے کے لیے مڑ گئی۔ کچھ دیر بعد میں نے صدر دروازہ بند کر لیا اور مڑ رہا تھا کہ پھر دستک ہوئی۔ میں نے دروازہ کھول دیا۔ چھوکری سامنے کھڑی تھی۔ اب اس کے ہاتھ میں سرخ کپڑے کا گولا سا تھا۔

"ہم بھول گئے تھے"، اس نے مجھے دیکھتے ہی کہا اور گولا میری طرف بڑھا دیا۔ "یہ رکھ لیجیے، کنجیاں ہیں۔"

"کیسی کنجیاں؟"

"پتا نہیں، طاہرہ بی بی نے دی ہیں۔"

میں نے صدر دروازہ بند کر لیا۔

دہرے دالان میں چٹائی پر کھڑے ہو کر میں نے گولے کو کھولا۔ یہ کسی دبیز مگر بہت نرم کپڑے کا پارچہ تھا جس کے ایک کونے میں پرانی وضعوں کی کنجیاں بندھی ہوئی تھیں۔ پارچے میں سے فصلی پھل کی خوشبو آ رہی تھی اس لیے میں نے جلدی سے کنجیاں کھول کر اسے چٹائی کے پائینتی زمین پر ڈال دیا اور کنجیوں کو گننے لگا۔ ان میں سے کچھ کا زنگ حال ہی میں صاف کیا گیا تھا۔ سب سے بڑی کنجی، جس کے پورے حلقے پر باریک بار یک بند سے کھدے ہوئے تھے، مجھے استاد کے چہرے سے مشابہ نظر آئی لیکن مشابہت کا سبب میری سمجھ میں نہیں آیا۔ میں نے کنجیاں چٹائی کے نیچے رکھ دیں اور ایک بار پھر لیٹ کر آنکھیں بند کر لیں۔ مجھے اسی جگہ پر اپنے باپ کا مرنا یاد آیا اور میں نے اپنا بدن اکڑا کر پیر پھیلا دیے۔ میری ایڑی کو نرم کپڑے کا لمس محسوس ہوا۔ میں نے آنکھیں بند کیے کیے خم ہو کر سرخ پارچے کو اٹھا لیا اور اس کا گولا بنا کر دور پھینکنے کو تھا کہ مجھے محسوس ہوا اس میں سے پھل کی خوشبو غائب ہو گئی ہے۔ میں اسے اپنے نتھنوں کے قریب لایا اور مجھے شبہہ ہوا کہ اس میں کوئی اور خوشبو موجود ہے۔ میری آنکھیں میری خواہش کے بغیر کھل گئیں۔ میں نے

پارچے کو پورا کھول کر دونوں ہتھیلیوں پر پھیلا لیا۔ یہ ایک بڑا رومال تھا جس کے بیچ میں بہت ہلکے سبز رنگ کے ریشمی دھاگے سے ایک مچھلی کڑھی ہوئی تھی۔ اس کے سفنوں کا جال چھوٹے چھوٹے پھندوں سے بنایا گیا تھا اور جگہ جگہ سے ادھڑا ہوا تھا لیکن اس وقت میری توجہ مچھلی سے زیادہ اس مدھم خوشبو کی طرف تھی جو پورے رومال میں گشت کرتی معلوم ہو رہی تھی۔ میں نے رومال کا بھرت گولا بنا لیا اور پوری سانس کھینچ کر اسے سونگھا۔ خوشبو بہت آہستہ آہستہ ابھرتی اور پھر ڈوب جاتی، جیسے کوئی سوتے میں سانس لیتا ہو۔ مجھے خوشبوؤں سے دلچسپی اور عطریات کی اچھی پہچان تھی، مگر اس مرکّب خوشبو کا کوئی بھی جز میری شناخت میں نہ آسکا۔ میں نے اسے دیر تک اور بڑے دھیان سے سونگھا اور مجھے ایسا محسوس ہوا کہ وہ رومال سے نکل کر بڑی آہستگی کے ساتھ میرے سینے میں اتر گئی ہے۔ میں اسے پہچان تو نہیں سکا لیکن مجھے یقین ہو گیا کہ اگر یہ ذرا بھی تیز ہوتی تو اسی وقت میرا دم گھٹ جاتا۔

جب نیند سے میری آنکھیں بند ہونے لگیں تو مجھے دھندلا سا خیال آیا کہ میں اپنے باپ کے مرنے کی جگہ پر لیٹا ہوا ہوں اور ابھی ابھی میں نے اپنے استاد کے مرنے کی خبر سنی ہے۔ لیکن اس خیال کا کوئی اثر ظاہر ہونے سے پہلے ہی میں سو گیا۔

میں نے اپنے استاد کو دیکھا، لیکن خواب میں وہ مجھے ایک نوجوان لڑکی نظر آیا اور اس پر، جیسا کہ خوابوں میں اکثر ہوتا ہے مجھ کو ذرا بھی تعجب نہیں ہوا۔

# عطرِ کافور

For on its wing was dark alloy,
And as it flutter'd - fell
An essence - powerful to destroy
A soul that knew it well.

EDGAR ALLAN POE

گر نو بہار آید و پرسد ز دوستان
گو اے صبا کہ آن ہمہ گلہا گیا شدند
(امیر خسرو)

# عطر کافور

(۱)

عطر بنانے کا وہ پیچیدہ اور نازک فن جو قدیم زمانوں سے چلا آرہا ہے اور اب ختم ہونے کے قریب ہے، بلکہ شاید ختم ہو چکا، میں نے نہیں سیکھا۔ مصنوعی خوشبوئیں تیار کرنے کے نئے طریقوں سے بھی میں واقف نہیں، اس لیے میرے بنائے ہوئے عطر کسی کی سمجھ میں نہیں آتے اور اسی لیے ان کی نقل تیار کرنے میں بھی ابھی تک کسی کو کامیابی نہیں ہوئی ہے، اس لیے لوگوں کو خیال ہونے لگا کہ میرے علم میں عطریات کے نایاب نسخے ہیں جنھیں میں اپنے سینے میں لیے ہوئے معدوم ہو جاؤں گا اور اسی لیے کبھی کبھی مجھ پر اصرار ہوتا ہے کہ ان نسخوں کو اپنے بعد کے لیے محفوظ کر جاؤں۔

میں جواب میں خاموش رہتا ہوں، اس لیے کہ میرے تیار کیے ہوئے عطروں میں کوئی خاص بات نہیں سوا اس کے کہ میں عام خوشبوؤں کو عطر کافور کی زمین پر قائم کرتا ہوں۔ میرا بنایا ہوا ہر عطر اصل میں عطر کافور ہے جو کسی دوسری مانوس خوشبو کے عطر کا بھیس بنا کر سامنے آتا ہے۔ میں نے خوشبوؤں کے بہت تجربے کیے۔ ایک زمانے میں تو میرے پاس خوشبودار چیزوں کا اتنا ذخیرہ ہو گیا تھا کہ اس کے قریب کھڑے ہونے سے سر چکرانے لگتا تھا۔ ان میں سے ہر چیز کی خوشبو اپنے آپ پھیلتی اور اڑتی رہتی تھی۔ آخر ایک وقت ایسا آتا تھا کہ چیز باقی رہتی اور اس کی خوشبو اڑ جاتی تھی اور شناخت کے لیے چیز کو دیکھنا یا چھونا پڑتا

تھا لیکن کافور کو میں نے ان چیزوں سے مختلف پایا۔ اس لئے کہ کافور اپنی خوشبو کے ساتھ ساتھ خود بھی اڑتا رہتا ہے۔ یہ ممکن نہیں کہ کافور باقی رہے اور اس کی خوشبو اڑ جائے؛ یہ البتہ ممکن ہے کہ کافور اڑ چکا ہو مگر اس کی خوشبو باقی ہو۔

لیکن میرے عطر کافور میں کافور کی خوشبو محسوس نہیں ہوتی۔ اس میں کوئی بھی خوشبو نہیں محسوس ہوتی۔ یہ سفید چینی کے بیچے سے چوکور مرتبان میں بھرا ہوا ایک بے رنگ محلول ہے۔ گول ڈھکنا ہٹانے پر مرتبان کے تنگ دہانے سے کسی قسم کی خوشبو نہیں نکلتی اور محلول کو سونگھنے سے خالی ویرانی کا احساس ہوتا ہے۔ لیکن دوبارہ پوری سانس کھینچ کر سونگھنے سے اس ویرانی میں کچھ دکھائی دیتا ہے۔ کم سے کم مجھے ایسا ہی محسوس ہوتا ہے۔ دوسروں کو کیسا محسوس ہوگا، میں نہیں کہہ سکتا اس لیے کہ میرے سوا کسی اور نے عطر کافور کو خاص شکل میں نہیں سونگھا ہے، لیکن جب میں اس پر کسی خوشبو کو قائم کر کے کوئی عطر بناتا ہوں تو سونگھنے والوں کو محسوس ہوتا ہے کہ اس عطر کی عام خوشبو کے نیچے کچھ اور بھی ہے۔ ظاہر ہے وہ اسے پہچان نہیں سکتے اس لیے کہ میرے عطر کافور میں کوئی خوشبو نہیں ہے۔

کافور کی طرح عطر کافور کو بھی اپنے آپ اڑتے رہنا چاہیے اور اپنی خوشبو کے ساتھ بلکہ اس سے پہلے ہی ختم ہو جانا چاہیے۔ میرا کمال یا جو کچھ بھی اسے کہا جائے، صرف یہ ہے کہ میں عطر کافور کو اس کی خوشبو کے ساتھ ختم نہیں ہونے دیتا۔ جب میں کافور کو محلول کی شکل میں لاتا ہوں تو اس کی خوشبو زیادہ تیز ہو جاتی ہے۔ اس کے بعد میں محلول کو روکتا ہوں اور اس کی خوشبو کو زائل ہونے دیتا ہوں، کبھی کبھی یہ خوشبو اس طرح زائل ہو جاتی ہے کہ محلول اور سادے پانی میں فرق نہیں رہ جاتا اور میں اسے پھینک دیتا ہوں، لیکن ایسا صرف اس وقت ہوتا ہے جب اس عمل کے دوران میرا دھیان بھٹکتا اور ہاتھ رکتا ہے۔ میرا دھیان آسانی سے نہیں بھٹکتا۔ جب میں عطر کافور بنانے میں لگ جاتا ہوں تو بڑے شور مجھے سنائی نہیں دیتے، قریب کی آوازیں بھی مجھے

نہیں سنائی دیتیں، لیکن دور سے آتی ہوئی کسی پرندے کی مدھم سی پکار یا ایسی ہی کوئی مبہم آواز میرا دھیان بھٹکا دیتی ہے۔ میرا ہاتھ رک جاتا ہے اور جب میں دوبارہ اپنے کام کی طرف متوجہ ہوتا ہوں تو دیکھتا ہوں کہ سیدھی ڈور کی طرح اوپر کو کھنچتی ہوئی خوشبو کا آخری سرا محلول میں سے باہر نکل کر چھت کی طرف جا رہا ہے اور اسے واپس نہیں لایا جا سکتا۔ اپنی محنت کے رائیگاں جانے کا میں افسوس نہیں کرتا اور دوبارہ اپنے کام میں لگ جاتا ہوں، پھر میرا دھیان نہیں بھٹکتا اور میں دیکھتا ہوں کہ نئے محلول کی خوشبو اوپر اٹھنے کے لیے زور کر رہی ہے۔ میں محلول کو آہستہ آہستہ گردش دیتا رہتا ہوں یہاں تک کہ اس میں چھوٹا سا بھنور پڑنے لگتا ہے۔ خوشبو اس بھنور کے ساتھ گھومتی ہے پھر ایک کمزور بگولے کی طرح اوپر اٹھتی ہے۔ میں اسے اٹھنے دیتا ہوں۔ اس کا پہلا سرا گھومتا ہوا چھت کی طرف جانے لگتا ہے لیکن جب اس کا آخری سرا باہر آنے کو ہوتا ہے تو میں محلول کو دوسری طرف گردش دیتا ہوں، یہاں تک کہ اس کا چھوٹا سا بھنور الٹا گھومنے لگتا ہے اور خوشبو کا کمزور بگولا نیچے بیٹھنا شروع ہوتا ہے۔ میں کبھی وقت کا حساب نہیں کر سکا، پھر بھی میرا خیال ہے اس میں بہت دیر لگتی ہے، لیکن میں اپنا ہاتھ رکنے نہیں دیتا اور محلول کو باری باری ایک طرف اور دوسری طرف گردش دیتا رہتا ہوں۔ آخر بار بار اوپر اٹھتی اور نیچے بیٹھتی ہوئی خوشبو نڈھال ہو کر دھندلانا شروع ہوتی ہے۔ اس وقت کوئی چیز اس کی طرف سے میرا دھیان نہیں ہٹا سکتی۔ خوشبو آہستہ آہستہ ابھرتی اور ڈوبتی رہتی ہے اور اسی میں کسی وقت غائب ہو جاتی ہے۔ بے رنگ محلول کو میں سفید چینی کے نیچے سے چوکور مرتبان میں بھر کر اس کا ڈھکنا بند کرتا ہوں اور اس کی طرف سے اپنا دھیان ہٹا لیتا ہوں۔ پھر بے خیالی میں میرا ہاتھ اس کی طرف بڑھتا ہے۔

ویرانی کا احساس، پھر اس ویرانی میں کچھ دکھائی دینا، اب۔ صرف عطر کا نور کے

سونگھنے پر موقوف ہے، لیکن اس ویرانی میں جو کچھ دکھائی دیتا ہے وہ عطر کافور کے بننے سے پہلے تھا، بلکہ عطر کافور کا بننا اسی پر موقوف ہے۔

(۲)

مجھے پرندوں کی زیادہ پہچان نہیں۔ لڑکپن میں تو میں گِنے چُنے گھریلو پرندوں سے زیادہ کے نام بھی نہیں جانتا تھا، البتہ جب کوئی خوش آواز پرندہ میرے مکان کی منڈیر پر یا باغ کے کسی درخت کی شاخوں میں بولتا تو میں گھر کے بڑوں سے اس کا نام معلوم کرتا اور اسی دن بھول جاتا، لیکن خود میرے گھر میں جو پرندے پالے جاتے تھے ان سب کے الگ الگ انسانی نام میں اپنی مرضی سے رکھ دیتا تھا۔ ان میں سے کسی کسی پرندے کو جب میں اپنے دیئے ہوئے نام سے پکارتا تو وہ واقعی میری طرف متوجہ ہو جاتا تھا۔ یہ پرندے مرتے رہتے تھے اور میں ہر پرندے کے مرنے کے بعد کچھ دن تک اسے یاد کرتا پھر بھول جاتا، پھر یہ بھی بھول جاتا کہ میں نے اس کا نام کیا رکھا تھا۔ اب میں ایک کے سوا اپنے رکھے ہوئے سارے نام بھول چکا ہوں اور جو مجھے یاد رہ گیا ہے وہ انسانی نام نہیں تھا۔ وہ کسی زندہ پرندے کا بھی نام نہیں تھا۔ وہ نام میں نے ایک تصویری پرندے کا رکھا تھا۔

یہ تصویر میرے ہی گھرانے کی کسی لڑکی نے بنائی تھی اور چوں کہ وہ لڑکی تھوڑے ہی دن بعد مر گئی تھی اس لیے تصویر کو مکان کے بڑے کمرے میں آتش دان کے اوپر اس طرح رکھا گیا تھا کہ کمرے میں داخل ہونے والے کی نظر سب سے پہلے اسی پر پڑتی تھی، اور نیا آنے والا اسے کچھ دیر تک ضرور دیکھتا رہتا تھا، پھر قریب جا کر غور سے دیکھتا۔ وہ واقعی دیکھنے کے قابل چیز تھی۔ بنانے والی نے سیاہی مائل لکڑی کے تختے پر کسی درخت کی چھال ایک پتلی لمبی شاخ کی شکل میں تراش کر چپکائی تھی، اس کے اوپر روئی کے بے داغ سفید پہل جما کر پرندے کا بدن بنایا تھا۔ کھلے ہوئے بازوؤں کے لئے روئی کے ساتھ اصلی

سفید پر بھی چپکائے تھے۔ آنکھ کی جگہ سرخ شیشے کا گول دانہ لگایا تھا اور نوکیلے پنجے کسی ناری کے کانٹوں سے بنائے تھے لیکن پرندے کے پنجے شاخ پر ٹکے ہونے کے بجائے اس سے ذرا اوپر اٹھے ہوئے تھے، اس لئے یہ سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ پرندہ شاخ پر اتر رہا ہے یا اس پر سے اڑ کر جا رہا ہے، شاید اسی لئے اُسے دیر تک دیکھنے سے الجھن سی ہونے لگتی تھی، لیکن میرے خاندان میں یہی سمجھا جاتا تھا کہ یہ اڑ کر جاتے ہوئے پرندے کی تصویر ہے۔

میں اسے کافوری چڑیا کہتا تھا۔ سیاہی مائل لکڑی کے تختے پر اس کی صاف دُھلی ہوئی روئی اور بے داغ پروں کی سفیدی دیکھ کر ٹھنڈک محسوس ہونے لگتی تھی۔ ایسی ہی ٹھنڈک مجھے کافور کو بھی دیکھ کر محسوس ہوتی تھی جو میرے گھر میں اکثر موجود رہتا تھا اس لئے کہ ہمارے یہاں کافور کا مرہم بنتا تھا۔ یہ مرہم منت بانٹا جاتا اور ٹھنڈا مرہم کہلاتا تھا۔ ایک دن گھر کی ایک ملازمہ اس مرہم کے لئے پتھر کی بڑی سل پر کافور پیس رہی تھی اور میں اس کے قریب بیٹھا ہوا تھا۔ ملازمہ کسی کام سے اٹھ کر گئی تو میں نے پتھر پر پھیلے ہوئے سفوف کو سمیٹ کر اس کی ڈھیری بنا دی۔ پھر اُسے ہتھیلی سے دبا دبا کر اِدھر اُدھر پھیلانے لگا۔ اتنے میں ملازمہ واپس آگئی۔ اس نے پکار کر کسی سے میری شکایت کی:

"دیکھئے سب خراب کر رہے ہیں۔"

اور میں ہاتھ جھاڑتا ہوا اُٹھ کھڑا ہوا۔ سل پر پھیلے ہوئے سفید سفوف کو دیکھ کر مجھے بڑے کمرے والے پرندے کے کھلے ہوئے بازوؤں کا اور اسے دیکھ کر محسوس ہونے والی ٹھنڈک کا خیال آیا اور اسی دن سے میں نے اس کا نام کافوری چڑیا رکھ دیا، اور میرے گھر میں اس کا یہی نام پڑ گیا۔ اس لیے کہ اس کا اصل نام کسی کو نہیں معلوم تھا بلکہ اصلیت میں اس قسم کے پرندے کا شاید وجود بھی نہیں تھا اور بنانے والی نے تخیل سے اپنے تصور سے ایک شکل بنائی تھی، البتہ اس میں کئی پرندوں کی مشابہت موجود تھی جن میں بعض شکاری پرندے بھی تھے۔ مجھ کو یہ سب نہیں معلوم تھا لیکن ایک دن میں نے شکار پر سے آئے ہوئے

کچھ مہمانوں کو بڑے کمرے میں لکڑی کے تختے کے سامنے باتیں کرتے دیکھا۔ وہ کافوری چڑیا کے بدن کے ایک ایک حصّے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے مختلف پرندوں کے نام لے لے کر ایک دوسرے کو قائل کر رہے تھے۔ ان کی گفتگو کا زیادہ حصّہ میری سمجھ میں نہیں آیا لیکن ذرا ہی دیر میں کافوری چڑیا مجھے کوئی بڑی پیچیدہ چیز معلوم ہونے لگی، اور مہمانوں کے جانے کے بعد میں دیر تک آتش دان کے سامنے کھڑا اُسے دیکھتا اور اُلجھتا رہا، اس کی بناوٹ میں کوئی پیچیدگی نہیں تھی۔ میں نے اس کی ایک ایک چیز کو غور سے دیکھا۔ آخر مجھے یقین ہو گیا کہ بنانے والی نے اسے بڑی سادگی اور آسانی کے ساتھ تھوڑی ہی دیر میں بنا لیا ہوگا، اور میں خود بھی کسی مشکل کے بغیر اسے بنا سکتا ہوں۔ مجھے حیرت بھی ہوئی کہ ابھی تک میں نے اسے بنانے کی کوشش نہیں کی، اور اسی وقت میں نے اس کے لئے سامان اکٹھا کرنا شروع کر دیا۔

اس کے بعد کئی دن تک میں لکڑی کا ایک تختہ ہاتھ میں لئے کافوری چڑیا کے سامنے کھڑا اسے بنانے کی کوشش کرتا رہا لیکن مجھ سے اس کی ایک چیز بھی نہ بن سکی۔ یہاں تک کہ بڑے کمرے میں، جسے مہمانوں کے خیال سے ہر وقت صاف ستھرا اور آراستہ رکھا جاتا تھا، ہر طرف بچی ہوئی روئی کے ٹکڑے اور مڑے تڑے سفید پر پھیلے رہنے لگے اور دو تین معمولی سی پابندیوں کے بعد آخر مجھے بڑے کمرے میں اپنا سامان لانے سے بالکل روک دیا گیا۔ اب میں اپنے چھوٹے سے کمرے میں بیٹھ کر کام کرنے لگا لیکن مجھے بار بار اُٹھ کر تصویر کو دیکھنے جانا پڑتا تھا۔ دس میں مجھے زیادہ فاصلہ نہیں طے کرنا ہوتا تھا اس لئے کہ میرے اس کمرے کا ایک دروازہ بڑے کمرے میں کھلتا تھا۔ میں کچھ دیر تک کافوری چڑیا کو غور سے دیکھتا پھر لپکتا ہوا اپنے کمرے میں آتا اور لکڑی کے تختے پر روئی کے پھل چپکانا شروع کر دیتا۔ کبھی کبھی مجھے خیال ہوتا کہ میں نے اس کا کوئی حصّہ بالکل صحیح بنا لیا ہے لیکن جب میں دوسرا حصہ بناتا تو پہلا حصہ غلط معلوم ہوتا اور اس کی وجہ سے دوسرا حصہ بھی غلط معلوم

ہونے لگتا، لیکن اتنی مشکلوں کے بعد بھی یہ خیال میرے دماغ سے دور نہیں ہوا کہ میں اسے آسانی سے بنا سکتا ہوں اور تھوڑی تھوڑی دیر بعد میں اس کے سامنے جا کھڑا ہوتا اور تعجب کرتا کہ وہ مجھ سے بن کیوں نہیں پاتی۔

ایک دن دوپہر کے وقت میں اس کے سامنے کھڑا ہوا تھا کہ میرے ساتھ کا کھیلنے والا ایک لڑکا مجھے ڈھونڈتا ہوا بڑے کمرے میں آ گیا۔ کچھ دیر تک وہ بھی اسے دیکھتا رہا، پھر بولا۔

"بالکل ایسی ہی ایک وہاں بیٹھی ہے۔"

"کہاں؟" میں نے پوچھا۔

"کنویں والے پیڑ پر،" اس نے کہا اور باہر کی طرف اشارہ کیا۔

"تم وہاں گئے تھے؟" میں نے پوچھا۔

اس نے اثبات میں سر ہلایا اور بولا:

"ہم تو روز وہاں جاتے ہیں۔"

"اب وہاں کون لوگ ہیں؟"

"کوئی نہیں۔ خالی پڑا ہے۔"

میں نے کافوری چڑیا کی طرف اشارہ کر کے پوچھا:

"وہ بالکل ایسی ہی ہے؟"

"پتوں میں ٹھیک سے دکھائی نہیں دے رہی ہے،" اس نے کہا، "لیکن پر بالکل ایسے ہی ہیں۔ چل کر دیکھ لو۔"

"اب وہ اڑ بھی گئی ہو گی۔"

"نہیں۔ دیر سے ایسے ہی بیٹھی ہے۔"

میرا تجسس بڑھ گیا۔

"آؤ دیکھیں ہو" میں نے کہا اور ہم دونوں باہر نکل آئے۔

احاطے کے مغربی سرے کی طرف بڑھتے ہوئے میں نے اس سے پھر دریافت کیا:

"وہاں کوئی نہیں رہتا؟"

"کہہ تو دیا۔ خالی پڑا ہے۔"

وہ زیادہ تر خالی ہی پڑا رہتا تھا۔ اس احاطے میں ہمارے مکان کے علاوہ وہی ایک مکان تھا۔ اس کا صدر دروازہ باہر سڑک پر کھلتا تھا لیکن اس کے بڑے سے عقبی صحن کا چھوٹا دروازہ احاطے میں ہمارے صدر دروازے کے عین سامنے تھا۔ اس کے ڈھیلے ڈھیلے پٹ کچی دہلیز پر ٹکے ہوئے تھے اور مٹی میں قریب قریب جم گئے تھے، پھر بھی میری عمر کے بچے بہ آسانی ان کے درمیان سے گزر سکتے تھے۔ جب وہ مکان خالی ہوتا تو میں اور میرے دوست احاطے میں کھیلتے کھیلتے کبھی کبھی اس عقبی صحن میں بھی چلے جاتے تھے، اور وہاں ہمارے آنے جانے کا راستہ یہی ڈھیلے پٹوں والا چھوٹا دروازہ تھا۔

اس دروازے میں سے باری باری گزر کر ہم صحن میں داخل ہوئے۔ درخت تک پہنچنے کی جلدی کے باوجود میں نے دروازے پر رک کر پورے صحن پر نظر دوڑائی۔ جھاڑ جھنکاڑ کی کثرت سے وہ اسی طرح جنگل بنا ہوا تھا۔ جگہ جگہ کوڑے کے چھوٹے بڑے ڈھیروں میں ان لوگوں کی نشانیاں تھیں جو اس مکان میں آکر رہتے اور چلے جاتے تھے۔ میں نے ہر چیز کو سرسری دیکھا اور اپنے ساتھی سے پوچھا:

"کہاں پر ہے؟"

اس نے ہونٹوں پر انگلی رکھ کر مجھے چپ کرایا اور ہم دونوں دبے پاؤں چلتے ہوئے بائیں جانب کنویں کے قریب پہنچے۔ کنواں مٹی، کوڑے اور درخت کی ٹوٹی ہوئی ٹہنیوں سے قریب قریب پٹ گیا تھا، اور اس میں گولائی سے چنی ہوئی ششش پہل اینٹوں کی صرف

دو تین اوپری قطاریں کھلی رہ گئی تھیں۔

درخت صحن کی بائیں دیوار اور کنویں کے بیچ میں تھا۔ ایک طرف دیوار کی روک ہونے کی وجہ سے اس کا زیادہ حصہ کنویں پر جھکا ہوا تھا۔ ہم لوگ اس پر چڑھتے نہیں تھے اس لئے کہ اس کی ورلی ٹہنیاں دیکھنے میں مضبوط نظر آتی تھیں لیکن ذرا سا بوجھ برداشت نہیں کر سکتی تھیں۔ اس کے بڑے گول پتوں پر ہلکے ہلکے روئیں تھے جن پر زیادہ تر گرد جمی رہتی تھی اور بدن میں ان کی رگڑ لگنے پر کھجلی ہوتی تھی۔ اس وقت ہوا بند تھی، اس لئے درخت بے حرکت تھا اور مرا ہوا سا معلوم ہو رہا تھا، ہوا چلتی تو پورا درخت ایک ساتھ اور ایک ہی طرح سے ہلتا اور اس جنبش کی وجہ سے اور بھی مرا ہوا معلوم ہوتا۔ اگر ہوا زیادہ تیز ہو جاتی تو اس میں سے چرچراہٹ کی آواز نکلتی اور اس کے ایک دو ٹہنے ضرور ٹوٹ کر زمین پر آ رہتے تھے۔

میرا ساتھی درخت کے نیچے کھڑا گردن اوپر اٹھائے اس کی شاخوں کو غور سے دیکھ رہا تھا۔ میں بھی بے آواز چلتا ہوا اس کے قریب پہنچ گیا۔ درخت کے تنے سے پیٹھ لگا کر میں نے اوپر دیکھا۔ اس کے پتے پرانے ہو گئے تھے اور گرنے کے قریب تھے۔ بعض بعض پتوں کے بیچ میں جال سے کھل گئے تھے جن کے پیچھے کھلی فضا کی سفیدی نظر آ رہی تھی۔ مجھے کئی بار ان کھلی ہوئی جگہوں پر کسی سفید پرندے کا شبہہ ہوا۔ آخر میرے ساتھی نے میرے پہلو میں کہنی مار کر انگلی سے اوپر ایک طرف اشارہ کیا۔ تین چار بڑے پتوں میں کچھ چھپے ہوئے اور کچھ دکھائی دیتے ہوئے بدن پر شروع میں مجھے فضا کی سفیدی کا گمان ہوا، پھر اس سفیدی کے ایک طرف کٹاؤ دار پروں کی ترتیب نظر آئی۔ پرندہ بہت بلندی پر نہیں تھا اور اس کا منھ پتوں میں چھپا ہوا تھا۔ میں نے اپنے ساتھی کو اشارے سے بتایا کہ میں درخت پر چڑھنے جا رہا ہوں۔ اس نے اشارے سے مجھے روکنے کی کوشش کی لیکن اس وقت تک میں تنے پر ایک پاؤں رکھ چکا تھا۔

اس درخت پر اس دن سے پہلے میں صرف ایک بار اپنے ساتھیوں سے شرط لگا کر

چڑھا تھا لیکن کچھ دور تک جا کر اتر آیا تھا، اس لیے کہ میرے سب ساتھی مجھے شرط جیتتے دیکھ کر بھاگ کھڑے ہوئے تھے۔ لیکن مجھے یہ اندازہ ہو گیا تھا کہ بدن کا زیادہ بوجھ ڈالے بغیر درخت کے اوپر تک پہنچا جا سکتا ہے۔ اسی اندازے سے کام لیتے ہوئے میں نے موٹی شاخوں کے سہارے سے اوپر کی طرف بڑھنا شروع کیا۔ آخر میں اتنی بلندی پر پہنچ گیا کہ پرندہ میرے داہنے ہاتھ کی زد میں آ سکتا تھا۔ میں نے بائیں ہاتھ سے ایک شاخ کو حلقے میں لیا اور اس کے نیچے والی شاخ پر مضبوطی سے پیر جما کر اپنے پورے بدن کو پرندے کی سمت جھکایا۔ اس کا صرف ایک طرف کا بازو دکھائی دے رہا تھا اور میں اس کے دونوں بازوؤں کو ایک ساتھ گرفت میں لینا چاہتا تھا تاکہ وہ پھڑپھڑا نہ سکے۔ اس کوشش میں میرا ایک پیر نیچے والی شاخ پر تھوڑا آگے بڑھا اور شاخ آہستہ سے چرچرائی۔ نیچے سے میرے ساتھی نے پکار کر کچھ کہا۔ میں نے ایک جھٹکے سے دونوں پیر اٹھا کر اوپر والی شاخ کو اپنے ہاتھ کے حلقے میں جکڑ لیا۔ میرا دوسرا ہاتھ پرندے سے کچھ اوپر تھا۔ نیچے والی شاخ پھر چرچرائی اور پورا درخت ایک ساتھ ہلا۔ میرے ساتھی نے پھر پکار کر کچھ کہا لیکن اتنی دیر میں پرندہ میری مٹھی میں آ چکا تھا۔ میں نے چرچراتی ہوئی شاخ کو دیکھا اور نیچے اترنے کے لئے کئی اور شاخوں پر باری باری پیر ٹکایا لیکن میرا پیر لگتے ہی ان کی کمزوری ظاہر ہو جاتی تھی۔ پرندے والے ہاتھ کو میں سیدھا آگے پھیلائے ہوئے تھا اور اس میں رہ رہ کر کھجلی سی دوڑتی محسوس ہو رہی تھی۔ صرف ایک ہاتھ کی مدد سے کسی طرح تنے پر پھسلتا ہوا میں نیچے آیا اور زمین پر پہنچ کر مشکل سے اپنا توازن قائم رکھ سکا۔ میرا ساتھی کنویں کا چکر کاٹ کر میری طرف آ رہا تھا کہ بڑی شاخ تیز چرچراہٹ کے ساتھ کنویں کے دہانے سے مل گئی، اور میرا ساتھی اس کی زد میں آ گیا۔ میں نے اسے پکڑ کر ایک طرف کھینچا اور ہم کنویں سے دور ہٹ کر کھڑے ہو گئے۔

"مل گئی؟" میرے ساتھی نے اپنے کپڑے جھاڑتے ہوئے پوچھا۔ میں نے اپنی مٹھی

کی طرف دیکھا۔ میرے ہاتھ پر چھوٹی چھوٹی لال چیونٹیاں دوڑ رہی تھیں اور پرندہ کئی دن کا مرا ہوا اور اندر سے کھوکھلا تھا۔ اس کے نوکیلے پنجوں میں بتوں کے کھلے ہوئے جال کا کچھ حصہ اُلجھا ہوا تھا، گردن سینے پر جھکی ہوئی اور آنکھیں بہہ چکی تھیں۔ مجھے اپنی محنت کے رائیگاں جانے کا افسوس ہوا۔ پرندے کو میں نے اپنے ساتھی کی طرف اچھال دیا اور اپنے ہاتھ پر رینگتی ہوئی چیونٹیوں کو پھونکیں مار مار کر اڑانے لگا۔ اس وقت مجھے اپنے ساتھی کی گھٹی ہوئی چیخ سنائی دی۔ پرندہ زمین پر پڑا ہوا تھا اور میرے ساتھی کا ایک پیر اس کے اوپر جم کر رہ گیا تھا۔ تب مجھے یاد آیا کہ وہ مُردہ چیزوں سے ڈرتا ہے اور جب اسے ڈر لگتا ہے تو اس کا بدن شل ہو جاتا ہے۔ میں نے آگے بڑھ کر اس کو آہستہ سے اپنی طرف کھینچا۔ کچھ دیر گم صُم رہنے کے بعد وہ چونکا اور مجھے حیرت سے دیکھنے لگا۔ پھر اس نے اپنے پیروں کی طرف دیکھا اور کئی قدم پیچھے ہٹ گیا۔ میں اس کی طرف بڑھا لیکن وہ اچانک مڑا اور بھاگتا ہوا عقبی دروازے سے باہر نکل گیا۔

میں بھی اس کے پیچھے پیچھے چلا، لیکن دروازے تک پہنچ کر مجھے خیال آیا کہ میں نے پرندے کو ٹھیک سے نہیں دیکھا، اس لئے میں واپس ہوا۔ پرندے کے قریب پہنچ کر میں اس پر جھکا۔ میرے ساتھی کے پیر کی داب سے وہ چپٹا ہو گیا تھا، اور اگر اس کے نیچے نرم مٹی کی جگہ لکڑی کا تختہ ہوتا تو میں یہی سمجھتا کہ میں نے بڑے کمرے والی کافوری چڑیا کی غلط سلط نقل تیار کر لی ہے۔

## (۳)

اس کے بعد سے کافوری چڑیا میں میری دلچسپی ختم ہو گئی اور میں پھر سے دوسری چیزیں بنانے میں لگ گیا۔ جب میں بہت چھوٹا تھا اس وقت بھی میری عادت تھی کہ ادھر اُدھر کی بے جوڑ چیزوں کو کسی طرح آپس میں جوڑ کر سب سے پوچھا کرتا تھا کہ میں نے کیا چیز بنائی ہے۔ گھر والے کسی چیز کا نام لے دیتے اور مجھ کو یقین آجاتا کہ میں نے واقعی وہی چیز

بنائی ہے بلکہ میں یہ بھی یقین کر لیتا کہ مجھے پہلے ہی سے اس چیز کے بنانے کا خیال تھا، اور میں اپنی کاریگری کے نمونے کو نمائش کے لئے بڑے کمرے میں آتش دان پر سجا دیتا اور اسے کافوری چڑیا سے کم نہ سمجھتا تھا۔ میں اپنی بنائی ہوئی چیزوں کو کھلونا ماننے پر تیار نہ ہوتا بلکہ ایک بار جب میں نے لکڑی کے دو تین ٹکڑوں کو آپس میں باندھا اور مجھے بتایا گیا کہ میں نے بہت عمدہ گاڑی بنائی ہے تو میں کئی دن تک ضد کرتا رہا کہ میرے گھر والے اسی گاڑی پر سوار ہو کر باہر جایا کریں، لیکن اپنی بنائی ہوئی ہر چیز کو میں کچھ دن بعد بھول جاتا اور آخر اسے آتش دان پر سے ہٹا دیا جاتا تھا۔ رفتہ رفتہ میرے پاس ٹوٹے پھوٹے پرانے اوزاروں کا ذخیرہ اور ایسا سامان اکٹھا ہو گیا تھا جس سے میں مختلف چیزیں بنا لیتا تھا۔ اصل سے ان چیزوں کی شباہت برائے نام ہوتی تھی، پھر بھی ان کو پہچانا جا سکتا تھا۔ چھوٹے کمرے میں میرے پلنگ کے نیچے طرح طرح کے اوزار، لکڑی کے ٹکڑے، خوش رنگ کپڑوں کی کترنیں، ٹین کی پتیاں، لوہے کے تار وغیرہ اور بعض پھلوں کی گٹھلیاں تک جمع رہتی تھیں اور میں اندھیرے میں بھی پلنگ کے نیچے ہاتھ ڈال کر اس انبار میں سے جو چیز چاہتا نکال سکتا تھا۔

کافوری چڑیا بنانے کے جوش نے مجھے اس سامان سے غافل کر دیا تھا مگر اب میں پہلے سے زیادہ شوق کے ساتھ اس کی طرف متوجہ ہوا۔ وقت بے وقت میرے کمرے سے ٹھونکنے پیٹنے کی آوازیں اٹھ کر دوسروں کے آرام میں خلل ڈالتی تھیں لیکن مجھ پر کوئی روک ٹوک نہیں ہوئی اس لئے کہ میں اس گھر کا لاڈلا بیٹا تھا، البتہ اپنی بے احتیاطی کی وجہ سے جب میں ہی اپنے ہاتھ زخمی کر لیتا تو میرا کام دو ایک روز کے لئے خود بخود رک جاتا تھا۔ جب میں بار بار زخم کھانے لگا تو میرے کمرے میں مستقل طور پر کافور کے مرہم کی ایک بڑی شیشی رکھ دی گئی، حالانکہ یہ مرہم صرف سنگین چوٹوں اور پرانے زخموں کے لئے تھا۔ میرے زخم معمولی اور وقتی ہوتے تھے اور کوئی بھی بازاری مرہم انہیں ٹھیک کر سکتا تھا لیکن میں جیسا کہ

میں نے کہا، اس گھر کا لاڈلا بیٹا تھا۔ میری بنائی ہوئی چیزیں میرے کہے بغیر آتش دان پر سجادی جاتیں اور مہمانوں کو خاص طور پر دکھائی جاتیں۔ کبھی کبھی جب میری سمجھ میں نہ آتا کہ اب کیا چیز بناؤں تو میں اپنے مکان کی چھت پر چلا جاتا جہاں سے احاطے کے دوسرے مکان کی چھت اور عقبی صحن کی دیوار صاف نظر آتی تھی۔ ہوا کے نرم جھونکوں کے ساتھ مجھے کبھی کبھی کسی مانوس یا نامانوس خوشبو کی لپٹ سی محسوس ہوتی اور اسی کے ساتھ میرے ذہن میں کوئی نہ کوئی تصویر سی بن کر لمحہ بھر میں غائب ہو جاتی تھی۔ ان بنتی بگڑتی تصویروں کو دیکھتے دیکھتے اچانک میں کوئی چیز بنانے کا فیصلہ کر لیتا اور تیزی سے نیچے اتر کر اپنے کمرے میں بند ہو جاتا۔

ایک دن میں مکان کی چھت پر کھڑا ان بادلوں کو دیکھ رہا تھا جو تیز دھوپ اور گرم ہواؤں کے طویل موسم کے بعد صبح سے آسمان پر جمع ہو رہے تھے۔ اس وقت بھی میرا وہی ساتھی جو مردہ پرندے سے ڈر گیا تھا، میرے پاس کھڑا تھا۔ ہم دونوں کو موسم کی پہلی بارش میں بھیگنے کا شوق تھا اور پانی برسنے کے آثار دیکھ کر وہ مجھے تلاش کرتا ہوا چھت پر آ گیا تھا۔ ہم بادلوں کے چھوٹے بڑے ٹکڑوں سے بننے والی شکلوں کو پہچان رہے تھے۔ ان ٹکڑوں کے پیچھے کہیں کہیں آسمان کی نیلاہٹ جھلک رہی تھی لیکن دیکھتے دیکھتے ان سب ٹکڑوں نے مل کر گہرے سرمئی رنگ کی ہموار تنی ہوئی چادر کی شکل اختیار کر لی۔ میں ہوا چلنے اور پانی برسنے کا انتظار کر رہا تھا اور اس انتظار میں اپنے ساتھی کو فراموش کر چکا تھا۔ کچھ دیر بعد ہوا کے چھوٹے چھوٹے جھونکے اِدھر سے اُدھر ہونا شروع ہوئے۔ انھیں جھونکوں میں سے کسی کے ساتھ مجھے ایک برف کی سی ٹھنڈی خوشبو کا احساس ہوا، لیکن یہ خوشبو نتھنوں کے بجائے میری آنکھوں سے ٹکرائی، اور ایک سفید ڈورے کے سرے کی طرح میرے سامنے سے اوپر کھنچ کر غائب ہو گئی۔ اسی وقت مجھے اپنے ساتھی کی آواز سنائی دی۔

"ویسی ہی معلوم ہوتی ہے۔"

وہ اوپر دیکھ رہا تھا۔ میں نے بھی اوپر دیکھا۔ ہمارے سروں کے اوپر ایک پرندہ منڈلا رہا تھا اور سفید ڈورا اس کے ساتھ ساتھ گردش کر رہا تھا۔

"یہ ڈورا کیسا ہے؟" میں نے اپنے آپ سے پوچھا۔

"کہیں سے لائی ہوگی،" میرا ساتھی بولا، "گھونسلہ بنانے کے لیے۔"

پرندہ کچھ نیچے ہو کر پھر چکر کھاتا ہوا اوپر اٹھا۔

"نہیں،" میں نے کہا، "ڈورا اس کے پنجے میں بندھا ہوا ہے۔"

"تو کہیں سے چھوٹ کے آئی ہوگی،" میرا ساتھی بولا، "معلوم نہیں کس کی ہے۔"

اس کے بعد ہم دونوں اسے خاموشی کے ساتھ دیکھتے رہے۔ اس کی اڑان سے تھکن ظاہر تھی۔ آہستہ آہستہ پر مارتا ہوا وہ چھت کے آس پاس منڈلا رہا تھا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ بیٹھنے کے لیے جگہ تلاش کر رہا ہے۔ آخر وہ ہمارے بائیں ہاتھ کی برجی پر اترا۔ وہ اپنے سامنے دور کی کسی چیز کو دیکھتا معلوم ہو رہا تھا اور بظاہر ہماری موجودگی سے بے خبر تھا۔ میں نے اپنے ساتھی کو چپ رہنے کا اشارہ کیا اور بہت دھیرے دھیرے برجی کی طرف بڑھنے لگا۔ برجی کے قریب پہنچ کر میں رکا۔ پرندہ اب نظر نہیں آرہا تھا لیکن ڈورا میرے سامنے لٹک رہا تھا اور میرا ہاتھ اس تک پہنچ سکتا تھا۔ میں نے مڑ کر اپنے ساتھی کی طرف دیکھا اور ایک بار پھر اسے چپ رہنے کا اشارہ کیا لیکن اسی وقت مجھے پروں کی آواز سنائی دی اور جب میں برجی کی طرف مڑا تو ڈورے کا سرا اوپر اٹھ کر میری پہنچ سے باہر ہو چکا تھا۔ میں اپنے ساتھی کے پاس واپس آگیا۔ پرندہ اب تیز رفتار سے دوسرے مکان کی طرف جا رہا تھا، لیکن ایک سیدھ میں اڑنے کے بجائے وہ کبھی داہنی طرف مڑ جاتا، کبھی بائیں طرف، جیسے کوئی زمین پر لڑکھڑاتا ہوا دوڑ رہا ہو، اور سفید ڈورا اس کے پیچھے سانپ کی طرح لہریں لے رہا تھا۔

"ویسی ہی ہے نا؟" میرے ساتھی نے پوچھا۔

میں کوئی جواب دیئے بغیر پرندے پر نظریں جمائے رہا۔ اب وہ اس مکان کے صحن کی دیوار پار کر کے ایک جگہ پر چکر کھا رہا تھا اور ہر چکر کے ساتھ کچھ نیچا ہو جاتا تھا۔ آخر وہ دیوار کے پیچھے ہماری نگاہوں سے اوجھل ہو گیا۔ کچھ دیر بعد وہ اسی جگہ پر اُبھرا۔ اس نے تیزی سے پر پھڑپھڑائے اور پھر نیچے بیٹھ گیا۔ پھر وہیں پر اُبھرا۔ دیر تک ہوا میں ایک ہی جگہ پر ٹکا ہوا پر پھڑپھڑاتا رہا۔ پھر آہستہ آہستہ نیچے جھکتا ہوا غائب ہو گیا۔ ہم اس کے اُبھرنے کا انتظار کرتے رہے لیکن وہ پھر نہیں اُبھرا۔

"یہ وہاں کیا کر رہی ہے؟" میرا ساتھی دیوار کے پار نظریں جمائے جمائے بولا۔

مجھے بادلوں کی ہلکی گڑگڑاہٹ سنائی دی اور گہرے سرمئی آسمان پر کئی جگہ بجلی کے لہریے بن کر غائب ہو گئے۔ اسی وقت مجھے خیال آیا اور اسی وقت میرے ساتھی نے کہا۔

"وہاں پر کنویں والا پیڑ ہے۔"

ہم نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا اور چپ ہو رہے۔ اوپر گڑگڑاہٹ کی آواز نے پہلو سے بدلے، پھر نیچے جھکی اور زمین کو چھو کر آہستہ آہستہ اٹھتی ہوئی آسمان میں گم ہو گئی۔ میں نے اپنے ساتھی کا ہاتھ پکڑ لیا۔

"چلو،" میں نے کہا، "اسے چھڑا دیں۔"

"نہیں،" وہ بولا اور اپنا ہاتھ چھڑانے لگا۔

"چلو،" میں نے پھر کہا۔

"نہیں،" وہ بولا، "ہم وہاں نہیں جائیں گے۔"

"وہ مردہ تھوڑی ہے،" میں نے کہا، "لیکن اگر پانی برس گیا۔۔۔۔"

لیکن اتنی ہی دیر میں اس کا ہاتھ ٹھنڈا ہونے لگا تھا اور وہ گم صم ہو کر میری طرف دیکھ رہا تھا۔

"اچھا، رہنے دو" میں نے کہا اور راستے وہیں چھوڑ کر نیچے اُتر آیا۔

---

فضا میں ابھی گرمی تھی اور درخت کے بڑے پتے لٹکے لٹکے سے نظر آرہے تھے لیکن ان کی روئیں دار سطح پر جمی ہوئی گرد کے نیچے سبزی جھلکنے لگی تھی۔ میں کنویں کا آدھا چکر کاٹتا ہوا درخت کے نیچے آگیا۔ اس کے پتوں میں کوئی جنبش یا آواز نہیں تھی، لیکن مجھے یقین تھا کہ پرندہ انھیں پتوں میں بلندی پر کہیں چھپا ہوا ہے، اس لئے میں دیر تک اسے تلاش کرتا رہا۔ آخر مجھے خیال ہونے لگا کہ وہ میرے پہنچنے سے پہلے ہی اڑ گیا ہوگا، مگر جب میں درخت کے نیچے سے ہٹ رہا تھا تو اس کے پتوں میں ہلکی سی آواز پیدا ہوئی جو میری پہچانی ہوئی نہیں تھی، پھر بھی میں نے فوراً فیصلہ کر لیا کہ یہ پتوں سے پروں کے رگڑ کھانے کی آواز ہے۔ میں رُک کر اوپر دیکھنے لگا۔ آواز پورے درخت سے آتی معلوم ہو رہی تھی۔ تب مجھے احساس ہوا کہ بارش خاموشی کے ساتھ شروع ہو چکی ہے۔ کچھ دیر اور ٹھہر کر میں کھلے میں آگیا۔ ایک فاصلے پر پہنچنے کے بعد میں نے گھوم کر درخت کو دیکھا۔

وہ بدل رہا تھا۔ اس کے روئیں دار پتوں پر سبز لکیریں ڈالتی ہوئی بوندیں گدلی ہو ہو کر نیچے گر رہی تھیں، اور لٹکے ہوئے پتے آہستہ آہستہ اوپر اٹھ رہے تھے۔ اچانک بارش تیز ہو گئی اور میں عقبی دروازے کی طرف مڑا۔ مٹی کی ہلکی خوشبو میرے نتھنوں سے اور اسی کے ساتھ پھڑپھڑاہٹ کی تیز آواز میرے کانوں سے ٹکرائی۔ میں نے پھر گھوم کر درخت کی طرف دیکھا۔ پرندہ اس سے ذرا اوپر ہوا میں ایک ہی جگہ پر ٹھہرا ہوا پر پھڑپھڑا رہا تھا۔ پانی کی موٹی بوندیں تیز چلتے ہوئے پروں سے ٹکرا کر اس طرح بکھرتی تھیں کہ پورا پرندہ ایک سفید سی دھند میں لپٹا ہوا معلوم ہوتا تھا۔ ان تھرتھراتی ہوئی دھند کے ہر طرف لگاتار گرتی ہوئی بوندوں نے آسمان سے

زمین تک سفید ڈوروں سے تان دیئے تھے۔

پورا صحن گیلا ہو گیا تھا۔ سوکھی مٹی پر بارش کے پہلے چھینٹے کے ساتھ اٹھنے والی مانوس خوشبو ختم ہو چکی تھی اور اب زمین کی پرتوں میں دفن خوشبوئیں ابھر رہی تھیں۔ میرے پیروں کے پاس خوشبوئیں زمین سے اٹھتیں، کچھ دیر ایک جگہ پر منڈلاتیں، پھر بارش کے تھپیڑے کھا کر بیٹھ جاتیں، لیکن میں نے ان پر زیادہ دھیان نہیں دیا۔ میں درخت کو دیکھ رہا تھا جس کے اوپر تھرتھراتی ہوئی دھند اور دھند میں سے آتی ہوئی پروں کی آواز اب غائب تھی۔ درخت کے پتے دھل کر گہرے سبز اور تنا سیاہ ہو گیا تھا۔ بارش اور تیز ہوئی تو پورا درخت دھندلا گیا۔ اور مجھے احساس ہوا کہ میں کپڑوں سمیت بھیگ رہا ہوں۔ میں غلام گردش کے دروازے کی طرف لپکا ہی تھا کہ ہوا بھی تیز ہو گئی۔ سردی سے میرا پورا بدن تھرتھرایا اور دروازہ مجھے بہت دور معلوم ہونے لگا۔ میں پلٹ کر اس کے مخالف سمت دوڑتا ہوا بین کے اس پتلے لمبے سائبان کے نیچے آگیا جو مکان کے اندرونی درجوں سے متصل تھا۔ سائبان سے گرتی ہوئی دھاروں نے میرے سامنے ایک پردہ لٹکا دیا تھا جس کے اس پار صحن میں بارش کی پھواریں سفید دھوئیں کی بڑی چادروں کی طرح ہوا کے جھونکوں کے ساتھ پھیلتی سمٹتی اور الٹ پلٹ ہوتی ہوئی ادھر ادھر اڑتی پھر رہی تھیں۔

ہوا سائبان کے نیچے بھی تھی اور اس کا ٹین لرز رہا تھا۔ سردی مجھے اپنی ہڈیوں میں اترتی محسوس ہوئی اور میں نے بوچھار سے بچنے کے لیے ادھر ادھر دیکھا۔ میری پشت پر تین دروازے تھے جن کے پٹ اوپر سے گول تھے اور ان میں نیلے شیشے لگے ہوئے تھے۔ مکان میرا کئی مرتبہ کا دیکھا ہوا تھا اور مجھے معلوم تھا کہ ان دروازوں کے پیچھے تین آتش دانوں والا بڑا کمرہ ہے۔ مجھے یاد آیا کہ بہت بچپن میں جب کبھی میں اپنے گھر والوں کے ساتھ اس کمرے میں آتا تھا تو میری ضد پر کوئی نہ کوئی مجھے گود میں اٹھا کر

میرا چہرہ بیچ والے دروازے کے شیشے سے لگا دیتا اور میں صحن میں پھیلی ہوئی نیلاہٹ کو دیکھ کر خوش ہوتا تھا۔ پھر مجھے اس مکان میں آکر رہنے والا آخری خاندان یاد آیا۔ وہ چھ سات لوگ تھے جو زیادہ تر الگ الگ گردن جھکائے چپ چاپ بیٹھے رہتے تھے۔ عورتیں گھر کا کوئی کام کرنے اٹھتیں، واپس اپنی جگہ پر آتیں اور گردن جھکا کر بیٹھ جاتیں، مرد کام پر سے واپس آتے، خاموشی کے ساتھ کسی کمرے میں چلے جاتے، لباس بدل کر نکلتے اور گردن جھکا کر بیٹھ جاتے، ایک لڑکی دوسری لڑکی سے کچھ پوچھتی، دوسری جواب دیتی، پھر دونوں چپ ہو کر گردن جھکا لیتیں۔ وہ سب لوگ مجھے کسی دھند میں لپٹے معلوم ہوتے تھے۔ اس زمانے میں کئی بار مجھے اس مکان میں آنا پڑا تھا۔ ہر بار میں غصے اور کوفت میں بھرا ہوا واپس جاتا، اپنے یہاں پہنچ کر ان لوگوں کے بیٹھنے کی نقل اتارتا اور کہتا کہ اب سے مجھے اس مکان میں نہ بھیجا جائے۔ اس پر میرے گھر والے ہنستے اور دو ہی تین دن بعد کوئی نہ کوئی کام نکال کر مجھے پھر ان لوگوں کے یہاں بھیج دیتے تھے۔ ایک دن وہ لوگ بلا اطلاع مکان خالی کر کے چلے گئے۔ اس کے بعد سے یہ مکان اسی طرح خالی پڑا تھا۔ اس کا آتش دانوں والا کمرا بھی شاید اُس وقت سے کھولا نہیں گیا تھا اور اس وقت میں اس کے باہر کھڑا بوچھار میں بھیگ رہا تھا۔ سردی میری برداشت سے باہر ہونے لگی تو میں نے اس کے تینوں دروازوں کو باری باری پیچھے ڈھکیلنے کی کوشش کی۔ پھر مجھے خیال آیا کہ اگر دروازے اندر سے بند نہ ہوتے تو زور پکڑتی ہوئی ہوا سے کب کے کھل چکے ہوتے۔ ہولنے اور زور پکڑا اور سائبان سے گرتا ہوا پانی اندر کی طرف مڑ گیا۔ اس پانی کے ساتھ ٹین پر مدتوں سے جمع ہوتا ہوا کوڑا بھی آ رہا تھا۔ مجھے اپنے کپڑوں پر کئی جگہ سیاہی مائل دھبے نظر آئے۔ میں سائبان کے نیچے سے نکلا اور دوڑتا ہوا درخت کے نیچے آگیا۔ اس وقت مجھ کو پھر اس پرندے کا خیال آیا اور بے سود سمجھتے ہوئے بھی میں نے اوپر شاخوں میں اسے تلاش

کرنے کی کوشش کی لیکن میری آنکھوں میں پانی بھر گیا۔ اسی وقت درخت آہستہ سے چرچرایا اور میں محض اندازے سے سائبان کی طرف بھاگا۔

وہ دن مجھے یہیں تک یاد ہے۔

(۴)

اس سال پانی بہت برسا۔ اتنا کہ پورا احاطہ دلدل بن گیا۔ بہت دن تک اس کی زمین خشک نہیں ہوئی اور خودرو پودوں اور گھاس نے اسے ڈھک لیا۔ میرے مکان کا صدر دروازہ بند کر دیا گیا اور آنے جانے کے لیے وہ عقبی دروازہ استعمال ہونے لگا جو سڑک کی طرف کھلتا تھا۔ اس تمام مدت میں اپنا خالی وقت میں نے زیادہ تر اپنے کمرے میں گزارا۔ میرا شوق دیکھ کر مجھے عمدہ قسم کے نئے اوزار منگوا دیے گئے تھے جن کی مدد سے لکڑی کو تراشنا، سخت ٹین سے لے کر دبیز شیشے تک کو کاٹنا، لوہے کے موٹے تاروں کو موڑنا اور توڑنا اور چیزوں کو آپس میں جوڑنا میرے لیے بہت آسان ہو گیا تھا۔ میں نے چھوٹے چھوٹے مکان اور طرح طرح کی گاڑیاں بنائیں۔ پہلے اپنی بنائی ہوئی چیزیں کچھ دن بعد مجھے معمولی اور بھدی معلوم ہوتیں اور میں انھیں ادھر ادھر پھینک دیا کرتا تھا لیکن ان بارشوں کے دوران میں نے جو چیزیں بنائیں ان میں کئی ایسی تھیں جو بعد میں دیکھنے پر مجھے پہلے سے بھی زیادہ اچھی معلوم ہوئیں اور جب انھیں آتشدان پر سجایا گیا تو مجھ کو حیرت ہوئی کہ میں نے انھیں کب اور کس طرح بنایا تھا۔ اسی زمانے میں ایک دن احاطے سے برساتی پودوں کو اکھاڑنے کے لیے مکان کا صدر دروازہ کھولا گیا تو میں نے دیکھا کہ احاطے کے بائیں طرف مٹی کا جو تودہ تھا اس کو پانی نے ایک چوتھائی سے زیادہ کاٹ دیا ہے اور اس کے اندر سے سفیدی مائل چکنی مٹی پانی کے ساتھ بہہ کر زمین پر کچھ دور تک پھیل گئی ہے۔ میں تودے کے کٹے ہوئے حصے کو قریب سے دیکھنے کے لیے آگے بڑھا

تو میرے پیر اس مٹی میں چپکنے لگے اور جب میں نے ہلکے قدموں سے اس پر چلنا چاہا تو میرا پاؤں اس طرح پھسلا کہ اگر مٹی میرے دوسرے پیر کو پکڑ نہ لیتی تو میں بری طرح گرتا۔ احاطے کی صفائی کرنے والا بوڑھا مزدور اس وقت میری ہی طرف دیکھ رہا تھا۔ اس نے مجھے سنبھل کر چلنے کی تاکید کی اور بتایا کہ یہ نایاب قسم کی مٹی ہے اور اس سے بہت نازک چیزیں بنائی جا سکتی ہیں۔ اس نے یہ بھی بتایا کہ یہ مٹی کہیں باہر سے لائی گئی ہے، اور یہ بھی کہ بہت پہلے اسی احاطے میں ایک شخص رہتا تھا جو اس مٹی کے چھوٹے چھوٹے پرندے بناتا تھا۔ بوڑھے مزدور نے اس شخص کا ذکر کرتے ہوئے دوسرے مکان کے عقبی دروازے کی طرف اشارہ کیا جس کے پہلو میں ایک ٹوٹی پھوٹی دیوار کے آثار اب بھی باقی تھے۔ اسی وقت مجھے مٹی کے کام کا شوق پیدا ہو گیا اور میرے کہنے پر مزدور نے تودے کے اندر کی قدرے خشک مٹی کھود کھود کر مکان کی ڈیوڑھی میں اس کا چھوٹا سا ڈھیر لگا دیا۔ اس نے مجھے مٹی کے بھگونے اور تیار کرنے کا طریقہ بھی بتایا اور واپس جا کر اپنے کام میں لگ گیا۔ میں نے تھوڑی سی مٹی اٹھائی اور اس کو دونوں ہتھیلیوں کے بیچ میں دبا کر دیکھا۔ اس میں ریت یا کنکر کی ذرا بھی آمیزش نہیں تھی اور اس پر میری ہتھیلی کی باریک سے باریک لکیر بھی صاف ابھر آئی تھی۔ اچانک مجھے محسوس ہوا کہ مٹی میں سے کافور کی ہلکی سی لپٹ شعلے کی طرح اوپر لپکی اور غائب ہو گئی۔ میں نے ہتھیلی کو اپنے نتھنوں کے قریب کر کے ایک سانس لی، لیکن مجھے کوری مٹی کی ٹھنڈی خوشبو کے سوا کچھ محسوس نہ ہوا۔ میں نے ایک اور گہری سانس کھینچی تو مجھے ہر طرف پھیلی ہوئی خاموشی کا احساس ہوا جیسے مکان کے اندر پتھر کی سل پر کچھ پیسے جانے کی آواز کم ہونے کے بجائے بڑھ رہی تھی۔ میں نے دونوں ہاتھوں میں تھوڑی مٹی سمیٹی اور اپنے کمرے میں چلا آیا۔

اب میں مٹی کی بھی چیزیں بنانے لگا جس کے لیے کسی اوزار کی ضرورت نہیں

پڑتی تھی۔ اچھی طرح گندھی ہوئی چکنی مٹی میرے کمرے کے ایک کونے میں ہمیشہ موجود رہتی۔ جانور اور پرندے مجھ سے نہیں بن سکے لیکن چھوٹے چھوٹے زیور اور عجیب عجیب وضعوں کے برتن وغیرہ میں آسانی سے بنالیتا تھا۔ خشک موسم آتے آتے میں مٹی کی بہت سی چیزیں بنا چکا تھا، اور جب دھوپ نکلنے لگی تو میں نے ان چیزوں کو سکھانا، آگ میں پکانا اور رنگنا شروع کیا۔ اس میں کئی بار میں نے اپنے ہاتھ بھی جلا لئے۔ لیکن اس سے میرا کام نہیں رکا، اس لئے کہ جلنے کی تکلیف کافور کا مرہم لگاتے ہی غائب ہو جاتی تھی۔ البتہ میری جلائی ہوئی آگ سے کبھی کبھی گھر کی دوسری چیزوں کو نقصان پہنچ جاتا، اس لئے مجھ کو گھر کے اندر آگ کا کھیل کرنے سے روک دیا گیا اور میں نے احاطے کے ایک کنارے پر اپنی چیزیں پکانے کا انتظام کر لیا۔ میری خاطر مکان کا صدر دروازہ، جو اب مستقل بند رہنے لگا تھا، کھول دیا جاتا تھا۔ تیز بارشوں نے احاطے کی کچی زمین کو جگہ جگہ سے کاٹ کر اس میں گہری گہری نالیاں سی بنا دی تھیں جنھوں نے صدر دروازے تک سواریوں کا، بلکہ کم روشنی میں آدمیوں کا بھی پہنچنا دشوار کر دیا تھا، کچھ اس وجہ سے اور کچھ سڑک کے رُخ کھلنے کی وجہ سے مکان کا عقبی دروازہ ہی اب صدر دروازے کے طور پر استعمال ہونے لگا تھا اور احاطے میں زیادہ تر سناٹا رہتا تھا جس کی وجہ سے میں اطمینان کے ساتھ اپنا کام کر سکتا تھا۔

ایک دن میں اپنے پکائے ہوئے برتنوں پر سے راکھ صاف کر رہا تھا کہ مجھے کچھ سنائی دیا اور میں نے گھوم کر دیکھا۔ دو آدمی احاطے میں داخل ہوئے تھے اور نالیوں سے کتراتے ہوئے صدر دروازے کی طرف جا رہے تھے۔ میں نے انھیں اس سے پہلے نہیں دیکھا تھا۔ صدر دروازے پر پہنچ کر وہ رُکے۔ انھوں نے دستک نہیں دی۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ وہ مکان کے اندر داخل ہونے یا نہ ہونے کا فیصلہ نہیں کر پا رہے ہیں۔ کچھ دیر تک انھیں دیکھتے رہنے کے بعد میں نے اپنے سامنے

رکھے ہوئے برتنوں کو آہستہ سے کھڑکھڑایا۔ اس طرح مجھے اندازہ ہو جاتا تھا کہ برتن پوری طرح پک گئے ہیں یا نہیں۔ آواز سن کر وہ میری طرف متوجہ ہوئے اور آہستہ آہستہ چلتے ہوئے میرے قریب آ گئے۔ کچھ دیر تک وہ میرے بنائے ہوئے برتنوں کی طرف اور میں ان کی طرف دیکھتا رہا۔ ان کے قد، چہروں کے رنگ اور ناک نقشے ایک دوسرے سے بالکل مختلف تھے، لیکن ان میں کچھ ایسی مشابہت بھی تھی جس کی وجہ سے مجھے یقین ہو گیا کہ وہ دونوں سگے بھائی ہیں۔ ان میں سے ایک نے صدر دروازے کی طرف اشارہ کر کے مجھ سے پوچھا:

"خالی مکان یہی ہے؟"

"جی نہیں، وہ ہے۔" میں نے کہا اور دوسرے مکان کی طرف اشارہ کیا۔ "اس کا دروازہ سڑک کی طرف ہے۔ یہ پچھلے صحن کا دروازہ ہے۔"

اس وقت میں نے دیکھا کہ دروازے کے پرانے ڈھیلے پٹوں کی جگہ نئی لکڑی کے پٹ لگا دیئے گئے ہیں اور دروازہ مضبوطی کے ساتھ اندر سے بند ہے۔

"یہ مکان....." اس نے پھر صدر دروازے کی طرف اشارہ کیا۔ "آپ یہیں رہتے ہیں؟"

میں نے اثبات میں سر ہلا دیا۔

"یہ آپ ہی نے بنائے ہیں؟" اس نے برتنوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے پوچھا۔

میں نے پھر اثبات میں سر ہلا دیا۔

"بڑے خوبصورت کھلونے ہیں۔"

"یہ کھلونے نہیں ہیں۔"

"نہیں؟" وہ مسکرایا۔ "پھر؟"

"برتن ہیں"

"بہت خوبصورت برتن ہیں۔ اور کیا کیا بناتے ہیں آپ؟"

میں نے کئی چیزوں کے نام لئے۔

"مگر کھلونے نہیں بناتے؟"

"جی نہیں۔"

"آپ تو بڑے کاریگر معلوم ہوتے ہیں۔ ان سب چیزوں کا کیا کرتے ہیں؟"

"انھیں سجادیا جاتا ہے" میں نے کہا۔ "بانٹا بھی جاتا ہے۔"

"کچھ ہمیں بھی ملے گا؟"

"ان میں سے جو اچھے معلوم ہوں لے لیجیے۔" میں نے کہا۔ "لیکن ابھی انھیں رنگنا ہے۔"

"تو پھر بعد میں۔" اس نے کہا اور پورے احاطے پر نظر دوڑائی۔

"آپ لوگ اس مکان میں آرہے ہیں؟" میں نے پوچھا۔

ہم دونوں تو گھومتے رہتے ہیں۔" وہ بولا۔ "ہمارے گھر والے آرہے ہیں۔"

"ان میں کوئی میرے اتنا لڑکا ہے؟"

وہ ہنسا:

"جی نہیں۔ بس دو تین عورتیں، باقی لڑکیاں ہی لڑکیاں۔" وہ پھر ہنسا۔ "اور سب آپ سے بڑی لیکن ...." اس نے رک کر برتنوں کی طرف اشارہ کیا۔ "ماہ رخ سلطان کو بھی اس طرح کی چیزوں کا بہت شوق ہے۔"

اس نے ایک بار اور پورے احاطے پر نظر دوڑائی، پھر بولا:

"اچھا ہم ذرا مکان دیکھ لیں۔"

وہ دونوں مڑنے لگے تو میں نے سلام کے لئے ہاتھ اٹھایا اور یہ سوچ کر شرمندہ ہوا کہ پہلے میں نے انھیں سلام نہیں کیا تھا۔

جب وہ احاطے سے نکل گئے اور میں اپنے کام میں لگ گیا تو مجھے خیال آیا کہ ساری گفتگو ان میں سے ایک ہی نے کی تھی۔ اسی وقت مجھے پھر کچھ سنائی دیا اور میں نے پھر گھوم کر دیکھا۔ دوسرا آدمی جو ابھی تک کچھ نہیں بولا تھا، میرے قریب کھڑا ہوا تھا۔ میری طرف دیکھے بغیر اس نے پوچھا:

"آپ لوگ علاج کس سے کراتے ہیں؟"

میں نے اپنے یہاں کے معالج کا نام بتا دیا۔

"وہ کہیں دور رہتے ہیں؟"

"قریب ہی ہیں" میں نے بتایا، اور پوچھا "کیا آپ کے یہاں کوئی بیمار ہے؟"

"نہیں" اس نے کہا، پھر دھیرے سے کچھ اور بھی کہا جو میری سمجھ میں نہیں آیا۔ اس کے بعد وہ خاموشی سے واپس چلا گیا۔

جب میں نے اپنے گھر والوں کو خبر دی کہ اس مکان میں نئے رہنے والے آ رہے ہیں تو مجھے پتہ چلا کہ یہ خبر سب کو پہلے ہی سے معلوم ہے، اور یہ بھی کہ اس مکان کی مرمت اور درستی کا کام بہت دن سے جاری ہے اور اب ختم ہونے کے قریب ہے۔ البتہ مجھ سے ان دونوں آدمیوں کے بارے میں کئی سوال کیے گئے جن سے میں نے احاطے میں گفتگو کی تھی۔ ظاہر ہے میں وہ گفتگو دہرانے کے سوا ان کے بارے میں کچھ نہیں بتا سکا۔ میرے گھر والوں کو بھی صرف اتنا معلوم تھا کہ وہ سگے بھائی تھے اور کسی اور ملک کے رہنے والے تھے جنھوں نے بچپن ہی میں اپنا وطن چھوڑ دیا تھا۔ میں نے بتایا کہ وہ دیکھنے میں غیر ملکی نہیں معلوم ہوتے تھے اور بڑے کمرے میں چلا آیا۔

آتش دان پر رکھی ہوئی اپنی چیزوں کو میں نے قرینے سے سجایا۔ مجھے بار بار ان چیزوں کی ترتیب بدلنا پڑی۔ آخر اطمینان ہو جانے کے بعد میں کئی قدم پیچھے ہٹا۔ اب بھی وہاں پر

سب سے نمایاں چیز کا فوری چڑیا ہی تھی۔ بہت دن بعد میں نے پھر اسے غور سے اور دیر تک دیکھا۔ وہ زندہ معلوم ہو رہی تھی۔ کئی بار وہ مجھے شاخ سے اوپر اٹھتی اور نیچے آتی محسوس ہوئی۔ مجھے پھر احساس ہوا کہ وہ بہت آسانی سے بنائی گئی ہوگی، اور پھر تعجب ہوا کہ میں اسے کیوں نہیں بنا پایا۔ مجھے اس پر بھی تعجب ہوا کہ میں نے اس کا کوئی اچھا سا انسانی نام کیوں نہیں سوچا۔ پھر میرا تعجب ہلکے سے پچھتاوے میں بدل گیا۔

اگر سب اسے کا فوری چڑیا نہ کہنے لگے ہوتے، میں نے افسردگی کے ساتھ سوچا، تو میں اس کا نام ماہ رُخ سلطان رکھتا۔

## (۵)

ماہ رُخ سلطان کو میں نے اسی ہفتے دیکھا۔ اس دن صبح سے میں اپنے کمرے میں پھیلے ہوئے سامان کی ترتیب درست کر رہا تھا۔ میرے پلنگ اور اس کے مقابل کی دیوار سے لگی ہوئی میز پر میری بنائی ہوئی چیزیں ڈھیر تھیں۔ زمین پر اوزار پھیلے ہوئے تھے اور میں پلنگ کے نیچے ہاتھ ڈال ڈال کر دوسرا سامان باہر نکال رہا تھا۔ اسی دوران مجھے احساس ہوا کہ بڑے کمرے میں ایک ساتھ بہت سے مہمان آگئے ہیں۔ میں نے ذرا پیچھے ہٹ کر ادھ کھلے دروازے پر لٹکتے ہوئے باریک پردے کے دوسری طرف دیکھا۔ بڑے کمرے میں مجھ کو لڑکیاں ہی لڑکیاں نظر آئیں جو سب عمر میں مجھ سے بڑی تھیں۔ میں نے ان کے رنگ برنگے لباسوں کا قدرے دلچسپی سے جائزہ لیا، پھر اپنے کام میں لگ گیا لیکن بڑے کمرے سے آتی ہوئی آوازیں مجھ تک پہنچ رہی تھیں۔ کرخت آواز والی کوئی بڑی بی اتنی تیز رفتاری سے بول رہی تھیں، جیسے انھیں اپنا ہر اگلا جملہ بھول جانے کا اندیشہ ہو۔ کبھی وہ سامان کی زیادتی کی وجہ سے کسی سفر میں ہونے والی پریشانیوں کی تفصیل بتاتیں، کبھی کسی مکان کا نقشہ کھینچتیں جسے چھوڑ کر آرہی تھیں، کبھی اپنے موجودہ مکان کی اچھائیوں اور برائیوں کا تذکرہ کرتیں۔ میرے گھر کی عورتیں زیادہ تر ان کی تائید

کر رہی تھیں، البتہ خود ان کے ساتھ کی لڑکیوں میں سے کوئی کوئی ان کی کسی بات میں مبالغہ بتا کر ہنسنے لگتی تھی۔ پھر مجھے نام سنائی دینا شروع ہوئے۔ بڑی بی غالباً لڑکیوں کا تعارف کرا رہی تھیں، ماہ رخ سلطان، سیم تن سلطان، دل افزا سلطان، زرتاج سلطان، پری پیکر سلطان وغیرہ۔ میرے یہاں کی عورتیں ان ناموں کی تعریفیں کر رہی تھیں اور لڑکیاں بار بار ہنس رہی تھیں، پھر ان کی ہنسی حیرت اور خوشی کی چیخوں میں بدل گئی۔ آوازوں سے مجھے اندازہ ہوا کہ وہ کافوری چڑیا کے سامنے کھڑی ہیں۔ پھر اسے بنانے والی کا ذکر آیا اور آوازیں کچھ دھیمی ہوئیں۔ تھوڑی دیر بعد پھر حیرت اور خوشی کی چیخیں بلند ہوئیں۔ اب آتش دان پر سجی ہوئی ان چیزوں کے نام لئے جا رہے تھے جو میں نے بنائی تھیں۔ یہ شروع میں مجھ کو اچھا معلوم ہوا، پھر یہ سوچ کر گھبراہٹ ہونے لگی کہ کہیں مجھے اس مجمع کے سامنے پیش ہونے کے لئے بلا نہ لیا جائے۔ میں بڑے کمرے کی طرف کا ادھ کھلا دروازہ بند کرنے کے لئے آہستہ سے اٹھا لیکن اس کوشش میں باریک پردے کے پیچھے میرا دیکھ لیا جانا یقینی تھا۔ میں تذبذب میں گرفتار تھا کہ مجھے اپنے سامنے لوہے کے موٹے تار کا ایک خم کھایا ہوا ٹکڑا نظر آیا اور میں نے بڑھ کر اسے اٹھا لیا۔ اسی وقت آتشدان کے قریب سے آواز آئی:

"ماہ رُخ سلطان! تم نے اسے نہیں دیکھا؟ بالکل زندہ معلوم ہوتی ہے۔"

میں نے تار کے ٹکڑے کو اپنے گھٹنوں پر دبا کر اس کا خم دور کیا اور اس کی مدد سے دروازہ بند کرنے کے لئے آگے بڑھنا شروع کیا تھا کہ مجھے بڑے کمرے میں اچانک پھیل جانے والی خاموشی کا احساس ہوا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ اب وہاں کوئی نہیں ہے۔ کچھ غور کرنے پر مجھے لباسوں کی سرسراہٹ اور سرگوشیوں کی آوازیں سنائی دینے لگیں، لیکن میری سمجھ میں نہیں آیا کہ وہاں کیا باتیں ہو رہی ہیں۔ میں نے تار کا ٹکڑا دروازے کی طرف بڑھایا تھا کہ اس کے دونوں پٹ پورے کھل گئے اور میری ایک عزیزہ پردہ ہٹا کر میرے کمرے

میں داخل ہوئیں۔ انھوں نے ہر طرف بکھرے ہوئے سامان کو ایک نظر دیکھا، پھر میرے پلنگ کے قریب گئیں اور اس پر پڑی ہوئی چیزوں کی طرف اشارہ کر کے مجھ سے بولیں:

"یہ سب ہٹاؤ، اور تم باہر جاؤ، جلدی۔"

میں نے احتجاج کرنا شروع ہی کیا تھا کہ انھوں نے ہاتھ اُٹھا کر مجھ کو خاموش کر دیا۔

"ماہ رُخ سلطان کی طبیعت خراب ہو گئی ہے۔" انھوں نے کہا۔ "وہ یہاں آرام کریں گی۔"

اور انھوں نے خود ہی پلنگ پر کی چیزیں اُٹھا اُٹھا کر میز پر ڈھیر کرنا شروع کر دیں۔ میں ان کا ہاتھ بٹانے کے سوا کچھ نہ کر سکا۔ وہ مجھے اپنا سامان قرینے سے رکھنے کے فائدے بتاتی اور پلنگ کا سامان ہٹاتی جاتی تھیں۔ پلنگ کا ایک پایہ زمین سے تھوڑا اٹھا ہوا تھا اور فرش سے بار بار اس کے ٹکرانے کی آواز آ رہی تھی۔ میں اس کے نیچے رکھنے کے لیے میز پر لکڑی کا کوئی ٹکڑا تلاش کر رہا تھا کہ دروازے کے پاس ایک اور عزیزہ کی آواز سنائی دی:

"آیئے۔" وہ پردہ اٹھائے ہوئے کہہ رہی تھیں۔ "یہاں لے آیئے۔"

مجھے دروازے پر عورتوں اور نوجوان لڑکیوں کا جھرمٹ نظر آیا لیکن میرے کمرے میں صرف ایک لڑکی اور ایک بڑی بی داخل ہوئیں۔ میری سمجھ میں نہیں آیا کہ ان میں کون کس کو سہارا دے کر لا رہا ہے۔ البتہ لڑکی کی نظریں جھکی ہوئی تھیں اور بڑی بی گردن پھرا پھرا کر کمرے کی ایک ایک چیز کو دیکھ رہی تھیں۔ انھوں نے لڑکی کو پلنگ پر بٹھایا اور پلنگ کا اٹھا ہوا پایہ فرش سے ٹکرایا۔ لڑکی کا سر تھوڑا پیچھے کو ڈھلکا ہوا لیکن نظریں اب بھی جھکی ہوئی تھیں۔ بڑی بی نے ایک بار پھر پورے کمرے کا جائزہ لیا، اور ان کی نگاہیں مجھ پر ذرا دیر کو رکیں۔ میں میز پر ہاتھ رکھے کھڑا تھا۔ میری عزیزہ نے میرے شانے کو آہستہ سے چھو کر مجھے باہر جانے کا اشارہ کیا اور میں کمرے کے دوسرے دروازے

سے۔ جو احاطے سے متصل نیچی دیواروں والے ایک چھوٹے صحن میں کھلتا تھا، باہر نکل آیا۔ صحن سے احاطے میں پہنچنا مشکل نہیں تھا۔ میں دیر تک احاطے میں گھومتا رہا۔

ماہ رُخ سلطان کو میں غور سے نہیں دیکھ سکا تھا۔ مجھے صرف اتنا یاد آیا کہ ان کے سفید دوپٹے کا ایک پلّو سر پر تھا، دوسرا ان کے پیروں تک پہنچ رہا تھا اور اس کا ایک کونا ان کے ایک ہاتھ کی مٹھی میں لپٹا ہوا تھا۔ میں کچھ بھول بھی رہا تھا، لیکن چکنی مٹی کے کٹے ہوئے تودے کے پاس سے گذرتے ہوئے مجھے یاد آیا کہ جب وہ میرے برابر سے گذر رہی تھیں تو مجھے کافور کی بہت ہلکی سی لپیٹ محسوس ہوئی تھی۔

احاطے میں گھومنے سے میرا جی بھر گیا تو میں پھر چھوٹے صحن میں داخل ہوا، اپنے کمرے کے دروازے کے پاس پہنچ کر میں نے کانوں پر زور دیا۔ اندر خاموشی تھی دروازہ پورا بند نہیں تھا، میں نے اسے تھوڑا اور کھولا۔ سامنے ہی مجھے اپنا خالی پلنگ نظر آیا، پھر بڑے کمرے سے آتی ہوئی باتوں کی آوازیں سنائی دیں اور میں دروازہ پورا کھول کر اپنے کمرے میں آ گیا۔

ماہ رُخ سلطان میز پر ایک ہاتھ رکھے سیدھی کھڑی ہوئی تھیں۔ دوپٹے کا کونا اب بھی اس ہاتھ کی مٹھی میں لپٹا ہوا تھا۔ ان کے دوسرے ہاتھ میں مٹی کا ایک ہار جسے میں نے ابھی رنگا نہیں تھا، دھیرے دھیرے لرز رہا تھا۔ آہٹ سن کر انھوں نے میری طرف دیکھا اور گردن کے اشارے سے مجھے اپنے قریب بلا لیا۔

"یہ آپ ہی نے بنایا ہے؟" انھوں نے ہار کو اپنے چہرے تک اٹھا کر پوچھا۔ "بہت خوب صورت ہے۔"

میں جھینپا ہوا چپ کھڑا رہا۔

"بہت خوبصورت ہے،" انھوں نے پھر کہا، اور پوچھا۔ "یہاں یہ مٹی مل جاتی ہے؟"

"جی نہیں۔" میں نے کہا۔ "کسی نے باہر سے لا کر احاطے میں جمع کی تھی۔"

"کس نے؟"

"معلوم نہیں۔" میں نے کہا۔ "وہ بہت پہلے تھا۔"

"اب نہیں ہے؟"

"شاید نہیں۔" میں نے کہا، اور پھر کہا۔ "وہ بہت پہلے تھا۔"

اس کے بعد وہ دیر تک چپ چاپ ہار کو دیکھتی رہیں۔ اس کے بڑے بڑے گونج اور پھول مجھے اچانک بہت بدرنگ معلوم ہونے لگے، اور میں نے کہا:

"اسے رنگنا باقی ہے۔"

"یوں ہی زیادہ اچھا معلوم ہو رہا ہے۔" ماہ رُخ سلطان نے کہا۔

پھر انھوں نے میز پر رکھی ہوئی دوسری چیزوں، برتنوں، گاڑیوں اور مکانوں کو اٹھا اٹھا کر دیکھنا شروع کیا۔ مجھے اپنی ان عزیزہ پر کچھ کچھ غصّہ آ رہا تھا جنھوں نے مجھے سامان ترتیب سے رکھنے کی نصیحت کرتے ہوئے یہ سب چیزیں بے ترتیبی کے ساتھ میز پر ڈھیر کر دی تھیں۔ مجھے اس کا خیال نہیں آیا کہ یہ بے ترتیبی ماہ رخ سلطان ہی کی وجہ سے ہوئی تھی، مگر میں نے دیکھا کہ ماہ رُخ سلطان ایک ایک چیز کو اٹھا کر اس طرح واپس رکھتی ہیں کہ میز پر چیزوں کی ایک ترتیب بنتی جا رہی ہے جو ان چیزوں کی ترتیب سے بہتر ہے جنھیں میں نے بڑے کمرے کے آتش دان پر سجایا تھا۔ انھوں نے ایک چھوٹی سی گاڑی اٹھائی، کچھ دیر تک اس کے پہیوں کو دیکھتی رہیں پھر اُسے میز پر رکھ کر تھوڑا سا چلایا اور بولیں:

"آپ کوشش کریں تو کھلونے بھی بہت اچھے بنا سکتے ہیں۔"

میں نے کچھ کہنے کی کوشش کی، پھر چپ رہا، پھر کوشش کی، پھر رک گیا، پھر آہستہ سے بولا:

"یہ کھلونے ہی تو ہیں۔"

اب ماہ رخ سلطان پہلی بار مسکرائیں اور بالکل تندرست معلوم ہونے لگیں، لیکن کچھ کہنے کے بجائے وہ خاموشی کے ساتھ میز پر سے چیزیں اٹھا اٹھا کر واپس رکھتی رہیں۔ انھوں نے لکڑی کا ایک پرانی وضع کا مکان اٹھایا، دیر تک اس کی محراب کے کٹاؤ کو دیکھتی رہیں، پھر بولیں:

"یہ سب بنانے میں آپ کے ہاتھ نہیں کٹتے؟"

"کبھی کبھی۔" میں نے کہا اور اپنے ہاتھوں پر پڑے ہوئے نشانوں کو دیکھا۔ ماہ رخ سلطان بھی اپنے ہاتھ کو دیکھ رہی تھیں لیکن اس پر مجھے کوئی نشان نظر نہیں آیا۔

بڑے کمرے میں باتوں کی آوازیں کچھ بلند ہو گئی تھیں۔ مجھے خیال آیا کہ ماہ رخ سلطان دیر سے کھڑی ہوئی ہیں۔ اسی وقت انھوں نے میز پر سے ایک چوکور گھڑی اٹھائی اور بولیں:

"یہ تو اصلی ہے۔"

"نہیں، یہ بھی ۔ ۔ ۔ ۔"

"دیر ہو گئی۔" انھوں نے گھڑی کی سوئیوں کو غور سے دیکھتے ہوئے کہا، پھر بڑے کمرے والے دروازے کو دیکھا اور بولیں۔ "سب پریشان ہونے لگیں گے۔"

"آپ کی طبیعت اب کیسی ہے؟" میں نے پوچھا، اور سوچا کہ یہ مجھے پہلے ہی پوچھنا چاہئے تھا۔

"ہماری وجہ سے آپ کو بھی پریشانی ہوئی۔" انھوں نے اس طرح کہا جیسے مجھے کوئی اطلاع دے رہی ہوں۔ میں نے پھر پوچھا:

"آپ کی طبیعت اب ٹھیک ہے؟"

ماہ رخ سلطان نے گھڑی کی سوئیوں پر سے نظر ہٹا کر پھر دروازے کی طرف دیکھا۔
میں نے بھی دروازے کی طرف دیکھا اور ایک بار پھر مجھے کافور کی ہلکی سی لپٹ محسوس ہوئی۔
ماہ رخ سلطان کہہ رہی تھیں:

"کبھی ہمارے یہاں آیئے۔"

اور میں نے دیکھا کہ وہ اپنی مٹھی میں لپٹے ہوئے دوپٹے کے بل کھول رہی ہیں۔ سارے بل کھلنے سے پہلے ہی مجھے ان کے ہاتھ میں ایک چھوٹے برتن کی جھلک نظر آنے لگی۔ میں نے کوشش کر کے نظریں دوسری طرف کر لیں۔ چند لمحوں بعد انھوں نے کہا:

"یہ ہم آپ کے واسطے لائے تھے۔"

میں نے دیکھا۔ وہ سفید چینی کا نیچا سا چوکور مرتبان تھا۔ ماہ رُخ سلطان نے اسے میری طرف بڑھایا تو مجھے ان کے ہاتھ پر بہت ہلکے نشان نظر آئے۔ میں نے مرتبان اُن سے لے کر اسے غور سے دیکھا۔ وہ اتنا چھوٹا نہیں تھا جتنا میں سمجھ رہا تھا۔ مجھ کو تعجب بھی ہوا کہ وہ ابھی تک ان کے ہاتھ میں کس طرح چھپا ہوا تھا۔

"بہت اچھا ہے۔" میں نے کہا "آپ ہی نے بنایا ہے؟"

"جب ہم آپ کے اتنے تھے تب بنایا تھا۔"

میں ان سے اس کے بنانے کی ترکیب پوچھنے والا تھا لیکن اسی وقت انھوں نے میز پر سے کوئی چیز اٹھائی اور اسے دیکھتے ہوئے کہا:

"یہ شاید کسی شیشی کا ڈھکنا ہے۔"

میں نے ڈھکنے کو دیکھا، پھر میز کو، پھر نیچے زمین کو۔ کافور کے مرہم کی کھلی ہوئی شیشی میز کے ایک پائے کے پاس اوندھی پڑی ہوئی تھی۔ تھوڑا مرہم اس میں سے نکل کر زمین پر آگیا تھا۔ میں نے شیشی اٹھائی اور بے سوچے سمجھے ماہ رخ سلطان کی طرف بڑھا دی لیکن ماہ رخ سلطان اس کا ڈھکنا میری طرف بڑھا رہی تھیں۔ میں نے ڈھکنا لے کر شیشی

پر کس دیا۔

"ٹھنڈا مرہم۔" میں نے انھیں بتایا۔

وہ پھر مسکرائیں اور بولیں:

"تو آپ کے ہاتھ زیادہ کٹتے ہیں۔"

پھر انھوں نے سنجیدگی سے کہا:

"ہمارے یہاں آیئے گا۔ اچھّا؟"

بے آواز قدموں سے دروازے کی طرف بڑھ کر انھوں نے اس کا ایک پٹ دھیرے دھیرے کھولا اور میرے کمرے سے باہر نکل گئیں۔ بڑے کمرے میں باتوں کی آوازیں دم بھر کو رکیں، پھر مجھے خوشی کی چیخیں، زور زور سے پیار کرنے کی آوازیں اور ماہ رُخ سلطان کے نام کی پکار سنائی دی۔

(۶)

اس مکان میں وہ لوگ بہت دن نہیں رہے اور میں ان لوگوں میں ماہ رُخ سلطان کے سوا اور کسی سے مانوس نہ ہو سکا اگرچہ میرا زیادہ سابقہ ان کی بہنوں سے رہا۔ مجھے ان کی بہنوں کی تعداد اور ان کی چھوٹائی بڑائی کا بھی صحیح صحیح علم نہ ہو سکا۔ وہ سب بہت رنگین کپڑے پہنتی تھیں، زور زور سے بولتی اور زور زور سے ہنستی تھیں اور ذرا سی ہنسی میں ان کے چہرے سُرخ ہو جاتے تھے۔ حیرت کے اظہار میں وہ چیخ پڑتیں اور بہت خوش ہوتیں تو رونے لگتی تھیں۔ اس طرح کی ایک دو عورتیں خود میرے خاندان میں بھی تھیں اور جب کبھی ان میں سے کوئی ہمارے یہاں مہمان ہوتی تو گھر کی رونق بڑھ جاتی تھی۔ لیکن ماہ رُخ سلطان کی بہنوں کو دیکھ کر مجھے وحشت ہونے لگتی تھی اور میں ان سے کترانا چاہتا تھا۔ خود ماہ رُخ سلطان ان میں کھو سی جاتی تھیں اور کبھی کبھی جب وہ ان کے جھرمٹ سے نکل کر مجھ سے بات کرتیں تو کچھ دیر تک ان کی آواز مجھے صاف سنائی نہیں دیتی تھی۔

ہمارے یہاں ان لوگوں کے آنے کے پانچویں چھٹے دن سے میرا اس گھر میں آنا جانا شروع ہوا۔ پہلی بار میں اپنے یہاں کی کسی مذہبی تقریب کا بلاوا لے کر وہاں گیا تھا۔ ادھیڑ عمر کی ایک عورت نے، جس کے بارے میں اندازہ نہیں ہوتا تھا کہ وہ ملازمہ ہے یا اسی خاندان کی کوئی فرد، مجھے تین آتش دانوں والے کمرے میں پہونچا دیا جہاں کرخت آواز والی بڑی بی بیٹھی ایک کالے ڈبے میں چھوٹی چھوٹی شیشیاں رکھ رہی تھیں۔ تقریب میں آنے کا وعدہ کرنے کے بعد کچھ دیر تک وہ مجھ سے میرے گھر والوں اور دور اور قریب کے رشتہ داروں کے بارے میں معلومات حاصل کرتی رہیں، پھر انھوں نے مجھے اپنے بارے میں معلومات فراہم کرنا شروع کیں اور ان کے بولنے کی رفتار تیز ہو گئی۔ جلد ہی مجھے اندازہ ہو گیا کہ وہ اپنے آپ سے باتیں کر رہی ہیں اور میری موجودگی کو فراموش کر چکی ہیں، اس لیے میں نے اِدھر اُدھر دیکھنا شروع کیا۔ نیلے شیشوں والے تینوں دروازے کھلے ہوئے تھے اور مکان کا عقبی صحن قریب قریب پورا نظر آ رہا تھا لیکن اس کا وہ حصّہ جہاں پر کنواں اور درخت تھا میری نگاہ سے اوجھل تھا۔ صحن کی زمین ہموار اور جھاڑ جھنکاڑ وغیرہ سے صاف کر دی گئی تھی۔ سائبان کے مقابل دور پر وہ دیوار نظر آ رہی تھی جس کا دروازہ احاطے میں کھلتا تھا۔ اس وقت دروازے کے دونوں پٹ کھلے ہوئے تھے اور احاطے کے دوسرے سرے پر میرے مکان کا صدر دروازہ، جو اندر سے بند تھا، دکھائی دے رہا تھا۔ احاطے میں تیز دھوپ پھیل گئی تھی۔ دو تین دن پہلے میں نے مٹی کے کئی زیور بنائے تھے اور آج انھیں دھوپ میں رکھنے جا رہا تھا کہ مجھے بڑی بی کے پاس بھیج دیا گیا۔ میں اپنے مکان کے عقبی دروازے سے نکل کر سڑک کا طویل راستہ طے کرتا ہوا اس مکان میں آیا تھا اور اسی راستے سے مجھے واپس جانا تھا۔ اس راستے کا خیال کر کے اور سامنے بند صدر دروازے کو دیکھ کر مجھے اپنا گھر ایک ہی وقت میں بہت قریب اور بہت دور معلوم ہونے لگا۔ بڑی بی کی آواز، جو مجھ کو پہلے دن بھی اچھی نہیں لگی تھی، اب اور بری معلوم ہو رہی تھی۔ اس وقت وہ اپنی لڑکیوں

کی پیدائش، پرورش اور تربیت میں پیش آنے والی دشواریوں کا تذکرہ کر رہی تھیں اور اس میں انھوں نے کئی ایسے مسئلوں کا بھی بیان کر دیا جن پر ہمارے کنبے میں میری عمر کے لڑکوں کے سامنے گفتگو نہیں کی جاتی تھی۔ بیچ بیچ میں وہ دوسری باتیں بھی چھیڑ دیتی تھیں۔ انھیں باتوں میں انھوں نے بتایا کہ مکان لینے والے دونوں بھائیوں میں سے ایک عطر کا کاروبار اور دوسرے فانوسوں کی تجارت کرتے ہیں۔ یہ بتاتے وقت انھوں نے چھت کی طرف ہلکا سا اشارہ کیا اور میں نے دیکھا کہ چھت کے کڑوں میں تین بڑے فانوس لٹک رہے ہیں۔ ان کی تکونی بلوری قلمیں کسی کسی رُخ سے چمک رہی تھیں۔ بیچ والے فانوس میں کٹاؤدار سفید شیشے کے گولے زنجیروں سے لٹکے ہوئے تھے۔ زنجیروں کی کڑیاں بھی شیشے کی تھیں گولے آہستہ آہستہ ہل رہے تھے اور ان پر پڑنے والی روشنی کئی رنگوں میں بٹ گئی تھی۔ اسی وقت مجھے زینے سے اترتے ہوئے بہت سے قدموں کی آوازیں سنائی دیں۔ زور زور سے بولتی اور ہنستی ہوئی لڑکیوں کا ہجوم اندر آیا اور کمرے میں کئی رنگ کا اندھیرا سا پھیل گیا۔ وہ سب بیچ والے آتش دان کے پاس جمع ہو کر کسی بات پر بحث کرنے لگیں اور میں بڑی بی سے اجازت لے کر اٹھ کھڑا ہوا، لیکن اچانک لڑکیوں کا ہجوم میری طرف بڑھا اور میں نے خود کو ان کے نرغے میں پایا۔ وہ سب میری بنائی ہوئی چیزوں کے نام لے لے کر تعریفیں کر رہی تھیں۔ بیچ بیچ میں سوالوں کی بوچھار بھی ہوتی تھی لیکن مجھے جواب دینے کا موقع کم مل رہا تھا اور اسے میں نے غنیمت جانا۔ پھر بھی جو دو تین جواب مجھے دینا پڑے ان میں سے ایک یہ بھی تھا کہ میں اپنی بنائی ہوئی زیادہ تر چیزیں دوسروں کو بانٹ دیتا ہوں۔ میری بات پوری ہونے سے پہلے ہی سب نے اپنی اپنی پسند کی چیزوں کی فرمائشیں شروع کر دیں۔ کسی کسی چیز کی فرمائش دو دو تین تین بہنیں ایک ساتھ کر دیتیں، پھر چیخ مار کر ایک دوسرے کو نوچنے اور زور زور سے ہنسنے لگتیں۔ مجھے ان کی آوازوں سے کمرے کے فانوس جھنجھناتے معلوم ہوئے۔ میرا سر دو تین بار آہستہ سے چکرایا اور مجھے ایسا معلوم ہوا کہ میں سُریلی آوازوں سے بھرے

ہوئے اس کمرے کو خواب میں دیکھ رہا ہوں۔ مجھے ان لوگوں کا خیال آنے لگا جو اس خاندان سے پہلے اس مکان میں آکر رہے تھے۔ ان کے جانے کے بعد سے آج پہلی بار میں اس بڑے کمرے میں آیا تھا۔ مجھے چند لمحوں کے لئے وہ سب لوگ اپنی اپنی جگہ پر گردن جھکائے بیٹھے نظر آئے۔ میرا سر پھر آہستہ سے چکرایا، آنکھوں کے آگے کئی رنگ ابھرے اور لڑکیوں کا جھرمٹ مجھے صاف نظر آنے لگا۔ وہ اب بھی فرمائشیں کر رہی تھیں۔ آخر بڑی بی نے انھیں ڈانٹا کہ مجھے خواہ مخواہ پریشان نہ کریں اور وہ سب ہنستی ہوئی تتر بتر ہو گئیں۔ بڑی بی نے مجھ سے کہا کہ لڑکیوں کی فرمائشوں پر دھیان نہ دوں، پھر بھی میں نے دوسرے دن سب چیزیں لا دینے کا وعدہ کر لیا۔ میں ابھی تک خود کو خواب کی سی حالت میں تصور کر رہا تھا، شاید اسی لئے مجھ کو ماہ رخ سلطان کا اپنی بہنوں کے جھرمٹ میں ہونا یا نہ ہونا محسوس نہیں ہوا، اور شاید اسی لئے اس وقت یہ بات بھی میرے ذہن میں نہیں آئی کہ ماہ رخ سلطان کی بہنوں نے میری بنائی ہوئی کئی ایسی چیزوں کی بھی فرمائش کی تھی جو میرے کمرے کی میز پر رکھی ہوئی تھیں اور ابھی تک بڑے کمرے کے آتش دان پر سجائی نہیں گئی تھیں۔ ان میں مٹی کا وہ ہار بھی تھا جسے رنگنا باقی تھا۔

---

گھر پہنچ کر مجھے معلوم ہوا کہ بڑی بی نے جو کچھ مجھ کو بتایا تھا وہ سب بلکہ اس سے بہت زیادہ، اور ایک بار نہیں کئی بار، وہ میرے گھر والوں کو پہلے ہی دن بتا چکی تھی، اس لئے بجائے اس کے کہ میں ان لوگوں کے متعلق اپنے گھر والوں کی معلومات میں اضافہ کرتا، خود میری معلومات میں یہ اضافہ ہوا کہ اس گھر کی سب لڑکیاں ایک ہی بھائی کی اولاد تھیں البتہ ماہ رخ سلطان کو دوسرے بھائی نے بیٹی بنا لیا تھا۔ اس وقت مجھے خیال آیا کہ ماہ رخ سلطان نے مجھے اپنے یہاں بلایا تھا اور میں انھیں سے ملے بغیر چلا آیا۔ اور اسی وقت میں نے فیصلہ کر لیا کہ ان کو اپنی بنائی ہوئی سب سے اچھی چیز دوں گا۔ میں نے آتش دان پر سجی ہوئی اور

اپنے کمرے کی میز پر رکھی ہوئی سب چیزوں کا جائزہ لیا، جن چیزوں کی بہت فرمائشیں کی گئی تھیں انھیں میں نے ایک ٹوکری میں رکھ لیا اور باقی چیزوں کا ایک بار پھر غور سے جائزہ لیا۔ ہر چیز میں مجھے کوئی نہ کوئی خامی نظر آئی۔ یہاں تک کہ میرا دماغ الجھ گیا اور میں آتش دان کے سامنے دیر تک بے حس و حرکت کھڑا رہا۔ کافوری چڑیا پر نظر جاتے جاتے مجھے پھر پچھتاوا سا ہونے لگا کہ میں نے اس کا کوئی اچھا سا نام کیوں نہیں رکھا۔ پھر مجھے اپنے کمرے میں میز کے پاس کھڑی ہوئی ماہ رُخ سلطان کا خیال آیا اور اچانک مجھ کو وہ چوکور گھڑی یاد آ گئی جسے انھوں نے اصلی سمجھا تھا۔ میں اپنے کمرے کی طرف بڑھا لیکن بیچ راستے ہی میں مجھے یاد آ گیا کہ وہ گھڑی میں نے دو دن پہلے اپنے ایک دور کے عزیز کو دے دی تھی۔ وہ مجھ کو بہت چاہتے تھے اور جب بھی ہمارے یہاں آتے میرے لئے کوئی نہ کوئی نئی قسم کا اوزار ضرور لاتے تھے۔ گھڑی میں نے ان کے مانگے بغیر، بلکہ ان کے انکار پر اصرار کر کے انھیں دی تھی، لیکن اس وقت مجھ کو ان پر ایسا غصہ آ رہا تھا جیسے وہ اسے مجھ سے چھین کر لے گئے ہوں۔ میں نے یہ بھی یقین کر لیا کہ وہ گھڑی میری کاریگری کا بہترین نمونہ تھی، حالاں کہ اس کا بنانا کچھ مشکل نہ تھا، اگرچہ اس میں دیر لگتی تھی۔ میں نے اسے پھر سے بنانے کا فیصلہ کر لیا اور اپنے کمرے میں بند ہو گیا۔

اس دن آدھی رات تک اور دوسرے دن دوپہر تک میں اسے بناتا رہا۔ میرے ہاتھ کئی جگہ سے کٹے اور کافور کے مرہم کی شیشی قریب قریب خالی ہو گئی لیکن میں نے اپنا کام نہیں روکا۔ جب وہ تیار ہو گئی تو میں نے اسے میز پر رکھ کر دیکھا، پھر بڑے کمرے کے آتش دان پر سجا کر دیکھا۔ ہاتھوں کی تکلیف کی وجہ سے میں اس میں پہلے کی سی صفائی نہیں لا سکا تھا، پھر بھی وہ میری بنائی ہوئی باقی چیزوں میں سب سے اچھی تھی۔ میں نے اسے ایک صاف کاغذ میں لپیٹ کر ٹوکری میں سب سے نیچے رکھ دیا۔

سہ پہر کو میں وہاں پہنچا۔ بڑی بی گھر پر نہیں تھیں ادھیڑ عمر عورت مجھے آتش دان

والے کمرے میں لائی اور میں نے جاتے ہی ٹوکری میں سے چیزیں نکال نکال کر کسی ترتیب کے بغیر آتشدان پر رکھنا شروع کیں۔ عورت ان چیزوں کو دیکھنے کے لئے آتشدان کے قریب آئی تو میں نے اُسے بتایا:

"یہ انھوں نے منگوائی تھیں۔"

"کس نے؟"

مجھے نام گنانے کے خیال سے الجھن ہوئی اس لئے میں نے کہا:

"سب نے۔"

"اچھا! ابھی بلاتے ہیں۔" عورت نے کہا اور کمرے سے باہر نکل گئی۔

میں آتش دان پر سب چیزیں رکھنے کے بعد اپنے ذہن میں ان کی ترتیب بنا رہا تھا کہ ماہ رُخ سلطان کی بہنیں ایک ساتھ کمرے میں داخل ہوئیں اور سیدھی آتشدان کی طرف لپکیں، کچھ دیر تک کل کی طرح شور اور ہنگامہ رہا اور میں کاغذ میں لپٹی ہوئی گھڑی ہاتھ میں لئے چُپ چاپ کھڑا اُن سب کو ننھی بچیوں کی طرح خوش ہوتے اور آپس میں جھگڑتے دیکھتا رہا۔ آخر وہ کچھ خاموش ہو کر میری طرف متوجہ ہوئیں اور اب انھوں نے قدرے سنجیدگی کے ساتھ مجھ سے باتیں کیں، اور مجھے احساس ہونے لگا کہ وہ سب واقعی مجھ سے بڑی ہیں۔

اب میں اس پریشانی میں گرفتار تھا کہ ماہ رخ سلطان سے کس طرح ملا جائے۔ آخر میری مشکل اس طرح حل ہوئی کہ اچانک ان کی ایک بہن نے مجھ سے پوچھ لیا:

"اور ماہ رخ سلطان کے لئے کچھ نہیں؟"

"وہ کہاں ہیں؟" میں نے پوچھا۔

ایک اور بہن نے نیلے شیشوں والا بیچ کا دروازہ تھوڑا کھول کر باہر جھانکا اور کہا:

"یہاں ہیں، آجایئے۔"

اس طرح بہت دنوں کے بعد میں ایک بار پھر اس ٹین کے سائبان کے نیچے آیا۔ ماہ رُخ سلطان

دیوار سے ملے ہوئے ایک تخت پر بیٹھی تھیں۔ ان کے سامنے ویسا ہی سیاہ ڈبا رکھا ہوا تھا جیسا میں نے ایک دن پہلے بڑی بی کے پاس دیکھا تھا۔ ماہ رخ سلطان ڈبے سے شیشیاں نکال نکال کر تخت پر سجا رہی تھیں۔ ہلکی سی مسکراہٹ کے ساتھ انھوں نے مجھے تخت پر بیٹھنے کا اشارہ کیا اور میں نے بیٹھتے ہی کسی تمہید کے بغیر کاغذ میں لپٹی ہوئی گھڑی ان کی طرف بڑھا دی۔ انھوں نے ایک نظر مجھے دیکھا، پھر دونوں ہاتھوں میں گھڑی لے کر اس کا کاغذ کھولا، کچھ دیر تک گھڑی کی سوئیوں پر نظریں جمائے رہیں، پھر بولیں:

"کتنی اچھی بنی ہے!"

میرا خیال تھا کہ وہ اسے وہی سی گھڑی سمجھ رہی ہیں جو اس دن میری میز پر رکھی ہوئی تھی، لیکن انھوں نے پوچھا:

"یہ آپ نے آج ہی بنائی ہے؟"

"کل اور آج۔" میں نے ذرا الجھ کر کہا۔ "جلدی میں بنائی ہے، اتنی صاف نہیں بن پائی۔"

"نہیں،" ماہ رخ سلطان نے کہا اور گھڑی کو مختلف رخوں سے دیکھا، پھر بولیں۔

"یہ زیادہ اچھی ہے۔ وہ تو اصلی معلوم ہوتی تھی۔"

انھوں نے ڈبے کے سامنے سے کچھ شیشیاں ہٹائیں اور ان کی جگہ پر گھڑی کو رکھ دیا۔ پیچھے رکھے ہوئے ڈبے کی سیاہی کے آگے گھڑی کے سارے رنگوں کی مدھم چمک تیز ہو گئی اور مجھے بھی وہ پہلے والی گھڑی سے زیادہ اچھی معلوم ہونے لگی۔ ماہ رخ سلطان نے اسے پھر اٹھایا، کئی بار اپنے چہرے سے دور اور قریب کر کے دیکھا، واپس رکھا، پھر اچانک بولیں:

"آپ کو کافور بہت اچھا لگتا ہے۔"

میری سمجھ میں فوراً کچھ نہیں آیا۔

"کافور؟" میں نے پوچھا۔
"آپ نے اس کا نام بھی کافوری چڑیا رکھا ہے۔"
"وہ... وہ تو سفید رنگ کی وجہ سے۔" میں نے کہا۔ "لیکن اس کا نام مجھے اچھا نہیں لگتا۔"
"بہت لوگوں کو اس سے ڈر لگتا ہے۔"
"کافوری چڑیا سے؟" میں نے حیرت سے پوچھا
"کافور سے۔" ماہ رُخ سلطان بولیں۔ "اس سے بہت لوگوں کو مرنے کا خیال آتا ہے۔"
"کافور سے؟" مجھے پھر حیرت ہوئی۔ "کافور تو بہت سی تکلیفوں کا علاج ہے۔"
"مرنا بھی تو بہت سی تکلیفوں کا علاج ہے۔"

ان کے لہجے میں ہلکی سی شوخی تھی، اس لئے میں نے ہنس کر ان کی طرف دیکھا، لیکن وہ مسکرا بھی نہیں رہی تھیں۔ مجھے وہ صرف کچھ سوچتی نظر آئیں۔ گھڑی کے پیچھے رکھے ہوئے سیاہ ڈبے پر وہ اپنی بیچ کی انگلی کا ناخن آہستہ آہستہ مار رہی تھیں جس کی ہلکی اور یکساں آواز کی وجہ سے گھڑی چلتی ہوئی معلوم ہو رہی تھی۔ اس آواز کے ساتھ ساتھ مکان کے دوسرے حصّوں سے ماہ رُخ سلطان کی بہنوں کے ہنسنے بولنے کی آوازیں بھی سنائی دے رہی تھیں۔ ان میں سے ایک آواز دروازے کے پاس آکر رُکی۔ ایک بہن سائبان کے نیچے آئی، ماہ رُخ سلطان کے قریب جاکر جھکی اور ان کی پیشانی پر پیار کرکے واپس چلی گئی۔ ماہ رُخ سلطان نے اسے جاتے دیکھا پھر شیشیوں کو ایک قطار میں رکھنے لگیں۔ انھوں نے گھڑی کو اٹھا کر سیاہ ڈبے کے پہلو میں رکھ دیا اور مجھ سے پوچھا:

"آپ کو یہ سب بنانا کس نے سکھایا؟"
"کسی نے نہیں۔"
"کسی نے نہیں؟"

میں نے انھیں بتایا کہ کس طرح بالکل بچپن سے مجھ کو چیزیں بنانے کا شوق تھا اور کس طرح میرے پاس رفتہ رفتہ اوزار جمع ہوتے گئے اور میں نے ابتدا میں کیا کیا بنایا اور بعد میں کیا کیا۔ اس بیچ میں ماہ رخ سلطان کی کئی بہنیں باری باری آئیں اور انھیں پیار کر کے چلی گئیں، اور جب ان میں سے ایک نے جانے سے پہلے جھک کر ان کے کان میں کچھ کہا تو مجھے احساس ہوا کہ میں دیر سے بیٹھا بول رہا ہوں، لیکن جب میں جانے کے لیے اٹھنے لگا تو ماہ رُخ سلطان نے مجھے روک لیا:

"کچھ دیر بیٹھیے۔" انھوں نے سیاہ ڈبے میں شیشیاں واپس رکھتے ہوئے کہا۔ "آپ باتیں کر کے ہیں اپنے بچپن کا خیال آجاتا ہے۔"

ان کا یہ کہنا مجھے اچھا معلوم ہوا لیکن اب میری سمجھ نہیں آرہا تھا کہ ان سے کیا باتیں کروں، اس لیے میں نے پوچھا:

"ان شیشیوں میں کیا ہے؟"

"عطر۔" ماہ رُخ سلطان نے کہا اور ڈبا میرے قریب رکھ دیا۔

اس وقت مجھے سائبان کے نیچے رہ رہ کر اُبھرتی اور دبتی ہوئی خوشبوؤں کا احساس ہوا۔ کبھی ایک خوشبو ابھرتی اور دوسری خوشبو اٹھ کر اسے دبا لیتی، کبھی کئی خوشبوئیں مل کر ایک ہو جاتیں، پھر منتشر ہوتیں، پھر ایک ہو جاتیں۔ ان خوشبوؤں سے طرح طرح کے رنگوں اور آوازوں کا خیال آتا تھا اور ان رنگوں اور آوازوں سے ماہ رخ سلطان کی بہنوں کا خیال آتا تھا جو اب شاید پھر آتش دانوں والے کمرے میں جمع ہو گئی تھیں۔ میں نے ڈبے کو ہاتھ میں اٹھا لیا اور وہ مجھے خوشبوؤں سے جھنجھناتا ہوا محسوس ہوا۔ میں نے پوچھا:

"یہ کن چیزوں کے عطر ہیں؟"

ماہ رخ سلطان نے مختلف پھولوں کے نام لینا شروع کیے تھے کہ مجھے محسوس ہوا ایک بھیگی ٹھنڈی اور خاموش سفید خوشبو ان تمام خوشبوؤں کو چھوتی ہوئی نکل گئی، پھر پلٹی اور پھر

سب کو چھوتی ہوئی نکل گئی، اور میں نے پوچھا:

"ان میں کافور کا عطر بھی ہے؟"

ماہ رخ سلطان نے رک کر مجھے غور سے دیکھا اور کچھ کوشش کر کے مسکرائیں۔

"کافور کا عطر نہیں بنتا۔" انھوں نے کہا۔ ڈبا میرے ہاتھ سے لیا اور اس میں کی ایک ایک شیشی کو چھو کر مجھے بتایا کہ اس میں کس چیز کا عطر ہے۔ اس کے بعد انھوں نے ڈبے کا ڈھکنا بند کر دیا۔

"ان میں کافور کا عطر نہیں ہے۔" انھوں نے اب میرے سوال کا جواب دیا، ایک بار پھر کوشش کر کے مسکرائیں اور میری دی ہوئی گھڑی پر ہاتھ رکھ کر بولیں:

"کافور کی خوشبو اس میں ہے۔"

"گھڑی میں؟" میں نے حیران ہو کر پوچھا اور گھڑی اٹھالی۔

"اس دن آپ کے کمرے میں بھی ایسی ہی خوشبو تھی۔"

"وہ کافور کا مرہم تھا۔" میں نے انھیں بتایا، اور اب مجھے یاد آیا کہ ماہ رُخ سلطان کے لئے گھڑی بناتے ہوئے کئی بار میرے ہاتھ کٹے تھے اور ہر بار میں نے کافور کے مرہم سے زخم کو چھپا لیا تھا اور اپنا کام روکا نہیں تھا۔ مجھے اپنے ہاتھوں میں ہلکی سی چرچراہٹ محسوس ہوئی اور میں سوچنے لگا کہ ماہ رُخ سلطان کو یہ سب بتاؤں یا نہ بتاؤں، لیکن اسی وقت انھوں نے کہا:

"آپ کے ہاتھ واقعی زیادہ کٹتے ہیں۔"

اور اسی وقت ان کی ایک اور بہن اُن کے قریب آکر جھکی۔ ماہ رُخ سلطان اُٹھ کر کھڑی ہو گئیں۔

"آیئے۔" انھوں نے مجھ سے کہا اور نیلے شیشوں والے دروازے کی طرف اشارہ کیا۔ میں ان کے ساتھ آتش دانوں والے کمرے میں واپس آیا، جہاں بڑے اہتمام کے

ساتھ کھانے پینے کی چیزیں سجائی گئی تھیں اور ان کی خوشبوؤں سے کمرا بھرا ہوا تھا۔ ماہ رُخ سلطان کی ہر بہن مجھے ہر چیز کھلانے پر تُلی ہوئی تھی۔ ان سب کے اصرار سے مجھے گھبراہٹ ہونے لگی جس کو کچھ اس خیال نے بڑھایا کہ یہ سارا اہتمام خاص میرے لئے ہے، اور کچھ اس بات نے کہ ماہ رُخ سلطان بھی میرے ساتھ بیٹھی تھیں مگر کچھ کھا نہیں رہی تھیں۔

(۷)

ماہ رُخ سلطان کی بیماری کا حال مجھے صرف اتنا معلوم ہوا تھا کہ کسی کسی دن ان کا دل آپ ہی آپ گھبرانے لگتا ہے اور اس وقت وہ چاہتی ہیں کہ ان کے پاس کوئی موجود نہ رہے اور کچھ دیر تک سب سے الگ تھلگ رہنے کے بعد خود ہی ٹھیک ہو جاتی ہیں۔ کبھی کبھی میں اپنی کاریگری کا کوئی نمونہ لے کر وہاں پہنچتا تو معلوم ہوتا کہ ماہ رُخ سلطان کی طبیعت خراب ہو گئی ہے اور وہ اپنے کمرے میں آرام کر رہی ہیں۔ میں اپنی بنائی ہوئی چیز بڑے کمرے کے کسی آتش دان پر ٹکا دیتا اور کچھ دیر ان کی بہنوں کے پاس بیٹھ کر چلا آتا۔ دوسرے یا تیسرے دن میں پھر وہاں جاتا۔ ماہ رُخ سلطان کبھی مجھے اپنی بہنوں میں گھری ہوئی اور کبھی سائبان کے نیچے تخت پر بیٹھی ہوئی ملتی تھیں۔ وہ گفتگو کی شروعات ہمیشہ ایک ہی سوال سے کرتی تھیں:

"اب آپ کیا بنا رہے ہیں؟"

میں جواب میں بولنا شروع کرتا تو ان کو بولنے کا موقع نہیں دیتا تھا، البتہ وہ بیچ بیچ میں کوئی مختصر سا سوال کر لیتیں جس سے صرف یہ ظاہر ہوتا تھا کہ وہ میری بات سن رہی ہیں۔

ایک دن میں نے دو اتنے چھوٹے چھوٹے مکان بنائے کہ دونوں ایک ساتھ میری مٹھی میں آسکتے تھے۔ مجھے یقین تھا کہ ماہ رُخ سلطان ان کی بہت تعریف کریں گی۔ مجھے یہ بھی یقین تھا کہ ان سے ملاقات ہو جائے گی اس لئے کہ ایک ہی دن پہلے ان کی طبیعت خراب ہو چکی تھی لیکن جب میں وہاں پہنچا تو معلوم ہوا کہ ان کی طبیعت خراب ہے اور وہ اپنے کمرے

میں آرام کر رہی ہیں۔ میں مکانوں کو مٹھی میں دبائے بڑے کمرے میں ان کی بہنوں سے باتیں کرتا رہا۔ آخر اٹھ کر واپس آنے لگا۔ اسی وقت ماہ رُخ سلطان کے کمرے کا دروازہ دھیرے دھیرے کھلا اور وہ اس کی دہلیز پر خاموش کھڑی نظر آئیں۔ ان کی بہنیں خوشی سے چیختی ہوئی ان کی طرف لپکیں اور باری باری ان کا نام لے لے کر انھیں چمٹانے اور پیار کرنے لگیں۔ ساتھ ساتھ وہ سب روتی بھی جاتی تھیں۔ ماہ رُخ سلطان دونوں ہاتھوں سے ہر بہن کے گال تھپتھپاتیں، پھر اسے آہستہ سے ایک طرف ہٹا دیتیں۔ اسی میں اُن کی نظر مجھ پر پڑی اور وہ بڑھ کر میرے قریب آ گئیں۔

"آپ بھی آئے ہیں؟" انھوں نے پوچھا

میں خاموش کھڑا رہا۔

"واپس جا رہے تھے؟" کچھ دیر بعد انھوں نے پھر پوچھا۔

میں پھر بھی خاموش کھڑا رہا۔ اتنی ہی دیر میں ان کی ساری بہنیں کہیں غائب ہو گئی تھیں، اور ان کے بولنے کی آوازیں بھی نہیں آ رہی تھیں۔ مجھے کچھ دیر پہلے کا شور یاد آیا اور میں نے پوچھا:

"آپ کی طبیعت اب کیسی ہے؟"

لیکن میری بات کا جواب دینے کے بجائے ماہ رُخ سلطان نے میری مٹھی کی طرف دیکھ کر پوچھا:

"آپ نے کیا بنایا ہے؟"

اور مجھے اپنے بنائے ہوئے مکان یاد آ گئے۔ میں نے مٹھی کھول کر ہتھیلی اُن کی طرف پھیلا دی اور انھوں نے کہا:

"کتنے اچھے ہیں!"

"آپ ہی کے لئے بنائے ہیں۔" میں نے کہا۔

ماہ رخ سلطان دیر تک میری ہتھیلی پر رکھے ہوئے مکانوں کو خاموشی سے دیکھتی رہیں پھر بولیں :

"ایک چیز ہم نے بھی آپ کے لئے تیار کرلی ہے۔"

پھر وہ آہستہ آہستہ چلتی ہوئی اپنے کمرے کی طرف واپس ہوئیں۔ دروازے پر پہنچ کر وہ میری طرف مڑیں اور بولیں :

"آیئے۔"

جب میں اس کمرے میں داخل ہوا تو ماہ رُخ سلطان اس کے بیچ میں بچھی ہوئی مسہری پر بیٹھ چکی تھیں۔ مسہری کے قریب ایک گدّے دار کرسی پر انھوں نے مجھے بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ کمرے میں مجھے کوئی خاص سامان یا سجاوٹ نظر نہیں آئی، البتہ دیواروں میں بنی ہوئی الماریوں پر پڑے ہوئے دبیز پردے بہت خوبصورت تھے اور ایک نظر میں ان پر سفید قالینوں کا دھوکا ہوتا تھا۔ کمرے کا ایک دروازہ آتش دانوں والے کمرے میں اور دوسرا سائبان کی طرف کھلتا تھا۔ اس دوسرے دروازے سے عقبی صحن کا ایک قطعہ نظر آرہا تھا لیکن میری سمجھ میں نہیں آیا کہ یہ صحن کا کون سا حصّہ ہے۔ میں نے اس کو پہچاننے کے لئے ذہن پر زور دیا تو مجھے کچھ اُلجھن سی محسوس ہوئی اور میں نے اُدھر سے توجہ ہٹا کر ماہ رُخ سلطان کی طرف دیکھا۔ وہ سر جھکائے کسی خیال میں کھوئی ہوئی معلوم ہو رہی تھیں۔ کچھ دیر بعد انھوں نے سر اُٹھایا لیکن ان کی نظریں اب بھی جھکی ہوئی تھیں۔ مجھے شبہہ ہوا کہ وہ بیٹھے بیٹھے سو گئی ہیں، لیکن اسی حالت میں وہ مسہری سے اُتر کر ایک دیواری الماری تک گئیں اور دونوں ہاتھوں میں کچھ سنبھالے ہوئے واپس آئیں۔ پہلی نظر میں وہ مجھے شفّاف سفید شیشے کے بے ترتیب ٹکڑے معلوم ہوئے۔ مسہری پر بیٹھ کر انھوں نے ان ٹکڑوں کو اپنے سامنے رکھا، کچھ دیر تک انھیں اس طرح دیکھتی رہیں جیسے اُن میں کوئی چیز تلاش کر رہی ہوں، پھر اُنھوں نے ایک گول ٹکڑے کو چٹکی میں پکڑ کر اچانک اپنا ہاتھ اوپر اُٹھایا۔ مجھے شیشوں کی ہلکی سی کھنک سنائی دی اور میں نے

دیکھا کہ ماہ رُخ سلطان کی انگلیوں سے ایک چھوٹا سا بلوری فانوس لٹک رہا ہے اور اس کی بہت ہلکی پرچھائیں ان کے چہرے پر بل رہی ہے اب وہ میری طرف متوجہ ہوئیں۔

"آپ کو شیشے کی چیزیں پسند ہیں؟"

"بہت خوبصورت ہے۔" میں نے کہا" یہ آپ ہی نے بنایا ہے؟"

"بنایا تو معلوم نہیں کس نے ہے۔" انھوں نے کہا۔" ہم نے اسے صرف بدل دیا ہے۔"

انھوں نے فانوس کو میری طرف بڑھا کر آہستہ سے گھمایا تو میں نے دیکھا کہ اس کی ہر لڑی کے آخر میں ایک نازک سی شیشی لٹکی ہوئی ہے۔ گھومتے ہوئے فانوس کے ساتھ سب شیشیاں ایک دائرے میں چکّر کھا رہی تھیں اس لئے ان کا صحیح صحیح شمار ممکن نہ تھا، پھر بھی میرا خیال ہے وہ دس سے کم نہیں تھیں۔ وہ سب شفّاف سفید شیشے کی تھیں لیکن ان میں مختلف رنگوں کے محلول بھرے ہوئے تھے۔

"ان شیشیوں میں عطر ہیں؟" میں نے پوچھا۔

"ایک خالی ہے۔" ماہ رُخ سلطان نے جواب دیا، پھر وہ کوشش کر کے مسکرائیں اور بولیں" اس میں آپ اپنی پسند کا عطر بھر لیجئے گا۔"

انھوں نے فانوس میرے ہاتھ میں دے دیا اور میں نے اسے کھلے ہوئے دروازے کے رُخ کر کے دیکھا۔ لمبائی میں وہ ایک بالشت سے زیادہ نہیں تھا۔ اس کی شفّاف لڑیوں کے پیچھے صحن کا قطعہ نظر آرہا تھا۔ میری نظر اس کی ڈھیلی اینٹوں والی دیوار پر پڑی اور اچانک میں نے پہچان لیا کہ یہ صحن کا وہ حصّہ ہے جہاں کنواں اور درخت تھا۔ کنویں کی جگہ اب بالکل ہموار زمین تھی لیکن جہاں پر درخت تھا وہاں مٹّی میں ہلکا سا ابھار نظر آرہا تھا۔ میں فانوس کو ہاتھ میں لئے دروازے سے نکل کر سائبان کے نیچے، پھر باہر صحن میں آگیا۔ مجھے پورا صحن بدلا بدلا محسوس ہوا اور میں ماہ رُخ سلطان کے کمرے میں واپس آگیا۔ اتنی دیر میں وہ شاید ایک بار پھر مسہری پر سے اٹھی تھیں اس لئے کہ اب کرسی کے گدّے پر موٹی دفتی کا ایک

رنگین ڈبّا رکھا ہوا تھا۔

"اسی میں رکھ لیجیے۔" انھوں نے ڈبّے کی طرف اشارہ کر کے کہا اور خاموش ہوگئیں۔ ایک بار پھر مجھے شبہ ہوا کہ وہ بیٹھے بیٹھے سو گئی ہیں۔ فانوس کو ڈبے میں رکھ کر میں دیر تک کرسی کے پاس خاموش کھڑا رہا لیکن انھوں نے مجھ سے بیٹھنے کو نہیں کہا۔ آخر میں نے پوچھا:

"آپ کی طبیعت کیسی ہے؟"

"ٹھیک نہیں ہے۔" انھوں نے آہستہ سے کہا۔

"کسی کو بلا لیجیے۔"

"نہیں۔" انھوں نے اور بھی آہستہ سے کہا۔ ان کا سر تھوڑا سا پیچھے کو ڈھلکا ہوا اور آنکھیں قریب قریب بند تھیں۔ کچھ تذبذب کے بعد میں آہستہ آہستہ چلتا ہوا ان کے کمرے سے نکل کر آتشدانوں والے کمرے میں آگیا۔

بڑی بی مجھے ایک آتش دان کی طرف منہ کیے کھڑی نظر آئیں۔ آہٹ سن کر وہ مڑیں اور قریب آکر میرے گھر والوں کی خیریت دریافت کرنے لگیں، لیکن ان کی نگاہیں میرے ہاتھ پر جمی ہوئی تھیں۔ آخر انھوں نے ڈبّے کی طرف اشارہ کر کے پوچھ لیا:

"اس میں کیا ہے؟"

میں نے ڈبّا ان کے ہاتھ میں دے دیا۔ انھوں نے اس کا ڈھکنا کھول کر فانوس کو تھوڑا سا باہر نکالا، کچھ دیر اسے دیکھتی رہیں، پھر بولیں:

"ماہ رخ سلطان نے دیا ہے؟"

میں کچھ نہیں بولا۔ انھوں نے فانوس کو تھوڑا اور باہر نکال کر غور سے دیکھا۔ پھر واپس رکھ کر ڈبے کا ڈھکنا بند کر دیا۔

"یہ ان کے پاس بچپن سے تھا۔" انھوں نے ڈبّا مجھے واپس دیتے ہوئے کچھ افسردگی

اور کچھ شکایت کے لہجے میں کہا، "کوئی اسے چھو نہیں سکتا تھا۔"
اس کے بعد وہ آتشدان کی طرف مڑ کر اس کی صفائی میں اس طرح لگ گئیں جیسے کمرے میں ان کے سوا کوئی موجود نہ ہو۔ مجھے ان کا لہجہ اپنے کانوں سے بار بار ٹکراتا محسوس ہوا۔ دفتی کا رنگین ڈبہ میرے ہاتھ میں اچانک بہت بوجھل ہو گیا اور کچھ دیر تک میری سمجھ میں نہ آیا کہ مجھے کیا کرنا چاہیئے۔ آخر میں نے خاموشی کے ساتھ اس ڈبے کو بڑی بی کی پشت کی طرف والے آتش دان پر ٹکا دیا اور باہر نکل آیا۔

کئی دن تک میں اِدھر اُدھر اپنے دوسرے رشتہ داروں کے یہاں وقت گذارتا رہا۔ صرف رات کو کسی وقت گھر میں آکر سو جاتا اور صبح اٹھنے کے تھوڑی ہی دیر بعد پھر نکل جاتا۔ وہ چھوٹا سا فانوس میری نگاہوں کے سامنے گردش کرتا رہتا اور ہر چیز میں مجھے اس کے کسی نہ کسی حصے کی شباہت نظر آتی، یہاں تک کہ میں نے خود ویسا ہی فانوس بنانے کا فیصلہ کر لیا، اور یہ جانتے ہوئے بھی کہ شیشے کو مختلف شکلوں میں ڈھالنا اور موڑنا میرے امکان میں نہیں، میں نے بازار سے معمولی عطروں کی کئی شیشیاں بھی خرید لیں۔
تیسرے یا چوتھے دن گھر سے نکلتے نکلتے اچانک مجھے خیال آیا کہ اگر میں کوشش کروں تو مٹی کا ویسا ہی فانوس بنا سکتا ہوں، پھر مجھے اس کا بنانا بالکل آسان نظر آنے لگا اور میں اپنے کمرے میں واپس آ گیا۔ اسی وقت میں نے کاغذ پر اپنی یادداشت سے اس فانوس کا نقشہ بنانے کی کوشش شروع کر دی، لیکن میں اسے زیادہ غور سے نہیں دیکھ سکا تھا۔ میں بار بار اپنے ذہن میں اس کا نقشہ بناتا لیکن ہر بار وہ مجھے ماہ رخ سلطان کے اٹھے ہوئے ہاتھ میں لٹکا ہوا اور دھیرے دھیرے گھومتا نظر آیا، اور اس کی کوئی چیز بھی میرے ذہن میں پوری واضح نہ ہو سکی۔ دیر تک کاغذ پر کاغذ خراب کرتے رہنے کے بعد میرا دماغ الجھنے لگا اور میں اٹھ کر بڑے کمرے میں آ گیا۔ وہاں میرے گھر کے قریب

قریب سب لوگ جمع تھے۔ دو تین بزرگ عورتوں نے مجھے دن دن بھر باہر رہنے پر ہلکی سی تنبیہہ کی۔ پھر ان میں سے ایک نے کہا:

"اچھا جاؤ، ذرا ماہ رُخ سلطان کی خیریت پوچھ کے آؤ۔"

"انھیں کیا ہوا؟" میں نے پوچھا۔

"اس کی حالت بگڑ گئی ہے۔"

اس کے بعد سب نے ماہ رخ سلطان کی بیماری پر بحث شروع کر دی، اور اسی میں میرے گھر کی سب سے معمّر خاتون بولیں:

"وہ تو جب یہاں آئی تھی اسی دن میں نے کہہ دیا تھا کہ اس کے اندر کچھ رہ نہیں گیا ہے۔"

پھر انھوں نے دوسروں سے اپنے قول کی تصدیق کرائی۔ میری سمجھ میں نہیں آیا کہ یہ لوگ کس زمانے کی بات کر رہے ہیں اور میں ان سب سے بحث کرنے پر تیار تھا لیکن مجھے پھر گھر سے باہر رہنے پر تنبیہہ کی گئی اور میں گھر سے باہر آ گیا۔

---

ادھیڑ عمر عورت نے مجھے آتشدانوں والے کمرے میں پہنچا دیا۔ سب سے پہلے میری نظر ان دونوں آدمیوں پر پڑی جنھوں نے احاطے میں مجھ سے بات کی تھی لیکن اس وقت وہ میری طرف متوجہ نہیں ہوئے اور اپنی اپنی جگہ گردن جھکائے بیٹھے رہے۔ بڑی بی ان سے کچھ فاصلے پر بیٹھی تھیں۔ میں ان کے قریب جا کر کھڑا ہو گیا، انھوں نے سر اٹھا کر مجھے دیکھا اور میرے کچھ پوچھنے سے پہلے ہی بولیں:

"حالت اچھی نہیں ہے۔"

پھر انھوں نے بھی گردن جھکا لی۔ میں دیر، یر کھڑا رہا۔ کچھ دیر بعد انھوں نے پھر سر اٹھایا، مجھے دیکھا اور ماہ رُخ سلطان کے کمرے کی طرف اشارہ کر کے بولیں:

"جائیے، دیکھ لیجیے۔"

میں جھجکتا ہوا اس کمرے میں داخل ہوا۔ ماہ رخ سلطان آنکھیں بند کئے مسہری پر لیٹی ہوئی تھیں اور ان کی دو بہنیں ان پر جھکی ہوئی تھیں۔ میں بھی جھک کر انھیں دیکھنے لگا۔ ان کا ایک ہاتھ کچھ کچھ دیر بعد تھوڑا اوپر اٹھتا اور پھر مسہری سے لگ جاتا تھا۔ اس پر پڑے ہوئے ہلکے ہلکے نشان کمرے کی کم روشنی میں بھی نظر آرہے تھے۔ ہاتھ پھر کچھ اوپر اٹھا اور پھر مسہری سے لگ گیا۔ میں نے پوچھا:

"ہاتھ میں کچھ تکلیف ہے؟"

"نہیں۔" ایک بہن نے جواب دیا۔ "بے ہوش ہیں۔"

اسی وقت ماہ رخ سلطان کا ہاتھ کچھ زیادہ اٹھا اور میرے نتھنوں کے قریب آکر وہیں ٹھہر گیا۔ میں نے سانس روک لی، لیکن ذرا ہی دیر میں میرا دم گھٹنے لگا تو میں نے پوری سانس کھینچی اور ایسا معلوم ہوا کہ ماہ رخ سلطان کی ہتھیلی میری سانس کے ساتھ گھوم کر اور کھنچ کر میرے نتھنوں سے آلگی۔ میری آنکھیں قریب قریب بند ہوگئیں اور مجھے مسہری پر ایک اجاڑ سی خوشبو اترتی محسوس ہوئی۔ میں نے پھر سانس روک لی پھر میرا دم گھٹا، پھر میں نے پوری سانس کھینچی۔ مجھے ویرانی کا احساس ہوا۔ میں نے ایک اور سانس کھینچی اور مجھے اس ویرانی میں کچھ دکھائی دیا۔ سب سے پہلے کافوری چڑیا، پھر کھوکھلا پرند اور میرے ہاتھ پر رینگتی ہوئی چیونٹیاں، پھر سفید ڈورے والا پرندہ اور صحن میں سفید دھوئیں کی چادروں کی طرح اڑتی ہوئی بارش کی پھواریں، پھر میرے کمرے میں میز کے پاس کھڑی ہوئی ماہ رخ سلطان، پھر سائبان کے نیچے بیٹھی ہوئی ماہ رخ سلطان، پھر ماہ رخ سلطان کے اٹھے ہوئے ہاتھ کے نیچے گھومتا ہوا فانوس اور اس میں لٹکتی ہوئی شیشیاں، جن میں سے ایک خالی تھی۔ میری آنکھیں پوری کھل گئیں۔ ماہ رخ سلطان کے چہرے پر فانوس کی پرچھائیں سی گھومتی معلوم ہو رہی تھیں اور ان کا ہاتھ مسہری سے لگا ہوا تھا۔

میں آتشدانوں والے کمرے میں آگیا اور کسی سے بات کئے بغیر گردن جھکائے ہوئے اس مکان سے باہر نکل آیا۔

سہ پہر کو مجھے یہ اطلاع دینے کے لئے پھر وہاں بھیجا گیا کہ میرے گھر کی سب عورتیں تھوڑی دیر میں آرہی ہیں لیکن ابھی میں اس مکان کے دروازے تک پہنچا تھا کہ مجھے اندر ماہ رخ سلطان کے نام کی پکار سنائی دی اور میں باہر ہی سے لوٹ آیا۔

# سالِ پنجم

My tale was heard and yet it was not told,
I saw the world and yet I was not seen;
My thread is cut and yet it is not spun,
And now I live, and now my life is done.

CHIDIOCK TICHBORNE

فانی ای؟ یا باقی ای؟ یا ہر دوئی؟
ہر دوئی؟ یا تو نہ ای؟ یا "نہ" توئی؟
(فریدالدین عطارؔ)

# ساسان پنجم

دور دور تک پھیلے میدانوں میں بکھری ہوئی ان کوہ پیکر سنگی عمارتوں کے بننے میں صدیاں لگ گئی تھیں اور ان کو کھنڈر ہوئے بھی صدیاں گزر گئی تھیں۔ خیال پرست سیاح ان کھنڈروں کے چوڑے دردں، اونچے زینوں اور بڑے بڑے طاقوں کو حیرت سے دیکھتے اور ان زمانوں کا تصور کرتے تھے جب گزشتہ بادشاہوں کے یہ آثار صحیح سلامت اور وہ بادشاہ بھی زندہ رہے ہوں گے۔ ان عمارتوں میں لگے ہوئے پتھر کی سلوں پر کندہ تصویروں کو زیادہ غور اور دل چسپی سے دیکھا جاتا تھا۔ صاف ظاہر تھا کہ یہ تصویریں اپنے زمانے کی تاریخ بیان کر رہی ہیں۔ ان میں تاج پوشیوں، جنگوں، ہلاکتوں، فاتح بادشاہوں کے دربار میں شکست خوردہ بادشاہوں کی حاضری اور دوسرے موقعوں کے منظر دکھائے گئے تھے جن سے ان پرانے زمانوں کی بہت سی باتوں کا کچھ اندازہ ہوتا تھا اور ان علاقوں کی پرانی تاریخ اور تمدن کے بارے میں کچھ غیر یقینی سی معلومات حاصل ہوتی تھی۔

انھیں کھنڈروں کے پتھروں پر کتبے بھی کھدے ہوئے تھے اور سیاح ان کو بھی دل چسپی سے اور دیر دیر تک دیکھتے تھے، لیکن ان تحریروں کو کوئی پڑھ نہیں سکتا تھا۔ دیکھنے میں صرف ایسا معلوم ہوتا تھا کہ کسی نے قطاروں کی صورت میں مختلف زاویوں سے تیروں کے پیکان بنا دیے ہیں، لیکن اس میں کسی کو شک نہیں تھا کہ

پتھر کی سلوں پر پیکانوں کی یہ قطاریں دراصل لمبی لمبی عبارتیں ہیں جنھیں اگر پڑھ لیا جائے اور سمجھ بھی لیا جائے تو ان کی مدد سے ان تصویروں کو بھی اچھی طرح سمجھا جاسکتا ہے اور بہت سی ایسی باتیں بھی معلوم ہوسکتی ہیں جن کا تصویروں سے معلوم ہونا ممکن نہیں۔

ہمارے عالم ایک مدّت سے ان تحریروں کو پڑھنے کی کوشش کر رہے تھے اور ناکام ہو رہے تھے۔ وہ جانتے تھے کہ یہ اسی زبان کی تحریریں ہیں جس کے نمونے ساسان پنجم نے فراہم کیے تھے، لیکن ان نمونوں کی مدد سے اِن کتبوں کو پڑھنا ممکن نہ ہوا اس لیے کہ وہ نمونے پیکانی تحریریں نہیں تھے، اور ساسان پنجم کو گزرے زمانہ ہوگیا تھا، بلکہ کسی کو یہ بھی معلوم نہ تھا کہ وہ کس زمانے میں تھا۔

آخر ایک مدت کی کاوشوں کے بعد جب مردہ زبانوں کو پڑھنے کا فن کافی ترقی کر گیا تو کھنڈروں کی انھیں تصویروں کی مدد سے اور کچھ دوسرے طریقوں سے ہمارے عالم پیکانوں کی شکل کی یہ تحریریں پڑھنے میں کامیاب ہو گئے۔ اور اِن تحریروں کی مدد سے اُن تصویروں کو بھی پوری طرح سمجھ لیا گیا۔ اِس طرح گویا تحریروں نے تصویروں کا احسان اتار دیا۔

ایک ایک کر کے سارے کتبے پڑھ لیے گئے اور اس خبر کا عام طور پر خیر مقدم کیا گیا کہ ہماری زبانوں میں ایک نئی زبان کا اضافہ ہوا ہے جو ہزاروں سال پُرانی ہے۔

لیکن اس زبان کا ساسان پنجم کے فراہم کیے ہوئے نمونوں کی زبان سے کوئی تعلق نہیں نکلا بلکہ ان دونوں زبانوں میں کوئی اتفاقی مشابہت بھی نہیں پائی گئی، اور یہ بات ہمارے عالموں کے گمان میں نہیں تھی اس لیے کہ ان کی کئی پشتوں نے

ان نمونوں کی زبان کا بڑی سنجیدگی سے مطالعہ کیا تھا اور اس کے بارے میں عالمانہ خیال ظاہر کیے تھے۔ اب انھوں نے فیصلہ کرلیا کہ ساسانِ پنجم زبانوں کی تاریخ کا سب سے بڑا فریب یا سب سے بڑا مذاق تھا، جس کا شکار ہونا ظاہر ہے انھیں پسند نہیں آسکتا تھا اس لیے اب اگر وہ چاہتے ہیں کہ ساسانِ پنجم اور اس کی زبان کو بھلا دیا جائے تو اس پر تعجب نہ ہونا چاہیے۔

لیکن ماننا پڑتا ہے کہ ساسانِ پنجم کے ساتھ انصاف نہیں ہوا۔ ایک تو اس کے وجود ہی کا انکار کر دیا گیا، اور انکار کی دلیل یہ دی گئی کہ چار ابتدائی ساسانوں کے بغیر پانچویں ساسان کا وجود قائم نہیں ہو سکتا، اور تاریخ میں ایک ساسان کے سوا ساسانِ دوم، ساسانِ سوم اور ساسانِ چہارم کا سراغ نہیں ملتا، لہٰذا ساسان پنجم بھی نہیں تھا؛ اسی کے ساتھ اس کی پیش کی ہوئی زبان کو بھی باطل کر دیا گیا۔ لائق عالموں نے بڑی محنت سے ثابت کیا ہے کہ ساسانِ پنجم نے جس زبان کے اصلی اور قدیمی ہونے کا دعویٰ کیا ہے اس زبان کا کبھی وجود نہ تھا، اور ساسان پنجم نے اس موہوم زبان کے جو لفظ درج کر کے ان کے معنی لکھے ہیں وہ سب لفظ خود اس کے گڑھے ہوئے ہیں اور اس سے پہلے نہ کسی زبان سے ادا ہوئے تھے نہ کسی قلم نے انھیں لکھا تھا۔ اور اس زبان کی جو قواعد ساسانِ پنجم نے ظاہر کی ہے وہ بھی سراسر اس کے ذہن کی اختراع ہے، حقیقتہً کسی بھی زبان کے جملوں میں لفظوں کی ترتیب اس طرح نہیں تھی جس طرح ساسان پنجم کی اس مفروضہ قواعد میں ملتی ہے۔

عالموں نے یہ تمام باتیں ثابت کرنے میں حیرت خیز مطالعے اور ذہنی کاوش کا ثبوت دیتے ہوئے علم اور منطق دونوں سے کام لیا ہے اور اس سلسلے کی ہر نئی دریافت ان کے دعووں کو مزید مستحکم کرتی جاتی ہے۔ تاہم انھیں دریافتوں کی بنیاد پر

یہ عالم اس کا بھی اعتراف کرتے ہیں کہ ایک عرصے تک سامانِ پنجم کو حقیقی اور اس کی زبان کو اصلی سمجھا جاتا رہا اور گزشتہ عالم اس زبان کے لفظوں کا فخریہ استعمال کرتے تھے، لیکن اِن لفظوں کی مدد سے ایک مستقل اور قائم بالذات زبان بولنے یا لکھنے میں ان گزشتہ عالموں کو کامیابی نہیں ہوسکی اگرچہ ان میں سے کئی اس زبان سے واقفیت کے مدعی بتائے جاتے تھے۔

آج کا عالم بتاتا ہے کہ گزشتہ زمانے میں کچھ لفظ استعمال ہوتے تھے جن کا حقیقی وجود نہیں تھا، وہ اس طرح کہ یہ لفظ جن معنوں میں استعمال کیے جاتے تھے دراصل ان کے معنی وہ نہیں تھے۔ دراصل ان کے معنی کچھ بھی نہیں تھے، تاہم ان میں کا ہر لفظ ایک مخصوص معنی کے لیے استعمال ہوتا تھا، یعنی بولنے والا ایک لفظ بولتا تھا اور اس سے ایک معنی مراد لیتا تھا اور سننے والا اس کے وہی معنی سمجھتا تھا جو بولنے والا مراد لیتا تھا، لیکن حقیقتہً اس لفظ کے وہ معنی نہیں ہوتے تھے جو بولنے والا مراد لیتا اور سننے والا سمجھتا تھا، اس لیے کہ دراصل وہ کوئی لفظ نہیں ہوتا تھا اور چونکہ وہ کوئی لفظ نہیں ہوتا تھا اس لیے اس کے کوئی معنی بھی نہیں ہوتے تھے۔

اور یہ بے معنی لفظ جس زبان کے سمجھے جاتے تھے اس زبان کا بھی حقیقی وجود نہیں تھا، اگرچہ عالم اس امکان کا انکار نہیں کرتے کہ کسی زمانے میں کہیں یہ زبان بولی اور سمجھی جاتی ہو، تاہم دراصل یہ کوئی زبان تھی نہیں۔

عالموں کی ساری تحقیق کا خلاصہ یہ ہے کہ نہ کوئی سامان پنجم تھا، نہ اس کی پیش کی ہوئی کوئی زبان تھی، نہ اس زبان کا کوئی لفظ تھا اور نہ اس لفظ کے کچھ معنی تھے۔

لیکن اسی ساری تحقیق کا خلاصہ یہ بھی ہے کہ ایک وقت میں کچھ معنی تھے جو بعض لفظوں سے ادا ہوتے تھے، اور یہ لفظ ایک زبان سے منسوب تھے،

اور اس زبان کا تعارف ایک شخص نے کرایا تھا، اور وہ شخص خود کو ساسان پنجم بتاتا تھا۔

(ابوالکلام خوش نویس)